حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

فردنامہ-۷

عبدالمغنی

ڈاکٹر ریحان غنی

Monograph-7

Abdul Mughni

By Dr. Raihan Ghani

پروفیسر عبدالمغنی ایک بلند پایہ نقاد، صاحب طرز ادیب، بلند قامت مذہبی دانشور اور بہترین مقرر ہونے کے ساتھ بہار میں اردو تحریک کے سالار بھی تھے۔ غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کی کاوشوں سے اردو نے بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کیا۔

پروفیسر عبدالمغنی نے ابتدائی تعلیم مدرسے سے حاصل کی اور عالم کا امتحان پاس کرنے کے بعد میٹرک سے لے کر ایم.اے. تک کی تعلیم، باضابطہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء میں انگریزی ادب میں ایم.اے. کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۱ء میں ان کا تقرر پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔

پروفیسر عبدالمغنی اردو ادب میں صالح اور مقصدی ادب کے علمبردار رہے۔ انھوں نے اپنی منفرد اور اعلیٰ فکر و نظر کے سبب دنیائے ادب میں ایک محترم مقام حاصل کیا۔ اردو اور انگریزی زبان میں ان کی چھیالیس کتابیں منظرِ عام پر آ کر اُن کی غیر معمولی ذہانت اور منفرد صلاحیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے مخصوص اور وقیع فکر و فن کے سبب پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کیا۔

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر ریحان غنی ہیں، جو بہار کی اردو صحافت میں معتبر اور معروف ہیں۔ اردو صحافت میں آپ کی خدمات چار دہائیوں پر محیط ہیں۔ ڈاکٹر ریحان غنی ایک بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ایک صاحبِ نظر ادیب بھی ہیں۔ بہار کی اردو تحریک سے بھی اِن کا گہرا اور طویل رشتہ رہا ہے۔ اردو تحریک کے سالار غلام سرور اور عبدالمغنی سے اِن کی گہری وابستگی رہی ہے۔ اپنی رحلت سے چند دنوں قبل عبدالمغنی نے جو آخری اِنٹرویو دیا تھا وہ ڈاکٹر ریحان غنی کے ذریعہ ہی لیا گیا تھا۔

مجھے توقع ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی کی شخصیت اور ان کی خدمات پر مبنی یہ فردنامہ اپنے مشمولات اور پیش کش کے اعتبار سے کامیاب اور کارآمد ثابت ہوگا۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

پروفیسر عبدالمغنی

ڈاکٹر ریحان غنی

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۷

Prof. Abdul Mughni

By
Dr. Raihan Ghani

نام کتاب	:	پروفیسر عبدالمغنی
مصنف	:	ڈاکٹر ریحان غنی
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	88
کمپوزنگ	:	سید فرحان غنی (شادمان کمپیوٹر، شاہ گنج، پٹنہ)
ترتیب وتزئین	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	تاج آفسیٹ پریس، دریاپور، پٹنہ۔۴

رابطہ : 9334020186

ملنے کا پتہ:
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

مشمولات

پیش لفظ:	امتیاز احمد کریمی	۴
پروفیسر عبدالمغنی: ایک معروضی تعارف	اسلم جاوداں	۶
ابتدائیہ :	ڈاکٹر ریحان غنی	۸

عنوانات

پروفیسر عبدالمغنی: ایک نظر میں	۱۱
تصنیفات و تالیفات: ایک نظر میں	۱۳
پروفیسر عبدالمغنی: ایک تعارف	۱۶
پروفیسر عبدالمغنی: دو تحریکات کے آئینے میں	۲۶
بہار میں اردو تحریک اور پروفیسر عبدالمغنی	۳۱
اردو تنقید اور پروفیسر عبدالمغنی	۵۱
پروفیسر عبدالمغنی کے اداریے۔ ایک جائزہ	۵۴
پروفیسر عبدالمغنی کے تبصرے	۶۰
مختلف شخصیات پر پروفیسر عبدالمغنی کی تحریریں	۶۴
پروفیسر عبدالمغنی کی منتخب تحریریں	۶۹
شبلی کے کمال تنقید کا تدارک: تردید و تدارک	۸۰
پروفیسر عبدالمغنی کا آخری یادگار انٹرویو	۸۳
کاروانِ اردو کے ٹوٹے ہوئے تارے	۸۷

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعر و ادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سربلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی و شعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، فضلِ حق آزاد، شوقؔ نیموی، انجمؔ مانپوری، یاسؔ یگانہ چنگیزی، بیدلؔ عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اخترؔ اورینوی، پرویز شاہدی، سہیلؔ عظیم آبادی، کلیم احمد عاجزؔ، رضا نقوی واہیؔ، واقفؔ عظیم آبادی، رمزؔ عظیم آبادی، شکیلہ اخترؔ، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعر و ادب بجا طور ناز کرسکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعر و ادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدردان ہے، نیز ان کے ادبی و شعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان و ادب کی قدر و منزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری و ادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شادؔ عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجزؔ، سہیلؔ عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہیؔ، وہاب اشرفی، رمزؔ عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفر پوری پر فرد نامے شائع کئے جارہے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی ایک بلند پایہ نقاد، صاحب طرز ادیب، بلند قامت مذہبی دانشور اور بہترین مقرر ہونے کے ساتھ بہار میں اردو تحریک کے سالار بھی تھے۔ غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کی کاوشوں سے اردو نے بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کیا۔

پروفیسر عبدالمغنی نے ابتدائی تعلیم مدرسے سے حاصل کی اور عالم کا امتحان پاس کرنے کے بعد میٹرک سے لے کر ایم.اے. تک کی تعلیم، باضابطہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء میں انگریزی ادب میں ایم.اے. کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۱ء میں ان کا تقرر پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔

پروفیسر عبدالمغنی اردو ادب میں صالح اور مقصدی ادب کے علمبردار رہے۔ انھوں نے اپنی منفرد اور اعلیٰ فکر ونظر کے سبب دنیائے ادب میں ایک محترم مقام حاصل کیا۔ اردو اور انگریزی زبان میں ان کی چھیالیس کتابیں منظرِ عام پر آ کر اُن کی غیر معمولی ذہانت اور منفرد صلاحیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے مخصوص اور وقیع فکر وفن کے سبب پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کیا۔

اس فرد نامے کے مصنف ڈاکٹر ریحان غنی ہیں، جو بہار کی اردو صحافت میں معتبر اور معروف ہیں۔ اردو صحافت میں آپ کی خدمات چار دہائیوں پر محیط ہیں۔ ڈاکٹر ریحان غنی ایک بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ایک صاحبِ نظر ادیب بھی ہیں۔ بہار کی اردو تحریک سے بھی اِن کا گہرا اور طویل رشتہ رہا ہے۔ اردو تحریک کے سالار غلام سرور اور عبدالمغنی سے اِن کی گہری وابستگی رہی ہے۔ اپنی رحلت سے چند دنوں قبل عبدالمغنی نے جو آخری اِنٹرویو دیا تھا وہ ڈاکٹر ریحان غنی کے ذریعہ ہی لیا گیا تھا۔

مجھے توقع ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی کی شخصیت اور ان کی خدمات پر مبنی یہ فرد نامہ اپنے مشمولات اور پیش کش کے اعتبار سے کامیاب اور کارآمد ثابت ہوگا۔

امتیاز احمد کریمی
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

پروفیسر عبدالمغنی: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

پروفیسر عبدالمغنی اردو ادب کے ایک اہم نقاد اور بہار میں اردو تحریک کے ایک اہم سالار رہے ہیں۔ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنوانے میں ان کا کردار مرکزی اور اہم رہا ہے۔ ان کو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں پر یکساں قدرت اور مہارت حاصل تھی۔ ان کی علمیت، ذہانت اور صلاحیت غیر معمولی تھی۔ انہوں نے مدرسہ ایجوکیشن بورڈ بہار سے عالم کا امتحان پاس کیا، پھر میٹرک کا امتحان دے کر پٹنہ یونیورسٹی میں اِنٹرمیڈیٹ (آرٹس) میں داخلہ لیا، اس کے بعد بی، اے (انگریزی آنرس) کیا اور ۱۹۶۰ء میں انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے بحال ہوئے۔ انہوں نے اردو تنقید نگاری اور اپنی بیش قیمت تحریروں و کتابوں کے ذریعہ اردو زبان وادب کی جو خدمت کی وہ نا قابلِ فراموش ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے ادب میں صالح اور مقصد آمیز تنقید کا روشن نظریہ پیش کیا۔ اُنہوں نے آزاد شاعری اور بے ماجرا افسانہ نگاری کو یکسر مسترد کیا، جس نے بے سمت اور بے نظریہ اردو ادب کو متاثر کیا اور کچھ حد تک ادبی رویے میں مثبت تبدیلی بھی آئی۔ انہوں نے اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

> ''میرا نظریۂ تنقید فکری طور پر دینی اور عملی طور پر اخلاقی ہے؛ اس لیے کہ میرے نزدیک صحیح معیار فکر دینی ہی ہوسکتا ہے اور صحیح اقدارِ حیات بھی اخلاقی ہی ہوسکتی ہے... ادب کی عظمت لازماً کسی اخلاقی معیار سے دریافت کی جائے گی اور اس معیار کی تشکیل ایک دینی نظر سے ہی ہوگی؛ اس لیے کہ دین ہی میں بیک وقت اخلاقیات و جمالیات دونوں کا بہترین اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ تصور پیش کرتا ہے اور صحیح معنی میں یہی ایک تصور آفاقی بھی ہے اور ابدی بھی''۔ (''معیار واقدار''، صفحہ: ج، د)

ایک دانشور، ایک نقاد اور ایک اچھے مقرر کی حیثیت سے پروفیسر عبدالمغنی ہندستان گیر شہرت

کے حامل رہے ہیں اور انہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں وبیش قیمت خدمات زبان وادب کے ذریعہ پورے ملک میں بہار کا نام روشن کیا اور اردو ادب میں اپنے لیے ایک وقیع مقام حاصل کرلیا ہے۔

تصانیف

۱۔ نقطۂ نظر، ۲۔ جادۂ اعتدال، ۳۔ ہندوستان میں مسلم اقلیت کا مسئلہ، ۴۔ برناڈ شا، ۵۔ تشکیل جدید، ۶۔ معیار واقدار، ۷۔ اقبال اور عالمی ادب، ۸۔ اقبال کا نظام فن، ۹۔ T.S. Eliots Concept of Culture، ۱۰۔ تنقید مشرق، ۱۱۔ طرز تعلیم، ۱۲۔ قرآن کا تصور جنس، ۱۳۔ تصورات، ۱۴۔ مابعد صنعتی معاشرہ اور اسلام، ۱۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ذہن وکردار، ۱۶۔ دہشت پسندی اور اسلام، ۱۷۔ مولانا مودودی کی ادبی خدمات، ۱۸۔ قرآن مجید کا ادبی اعجاز، ۱۹۔ اسلوب تنقید، ۲۰۔ Islamic Civil Code، ۲۱۔ تنویر اقبال، ۲۲۔ عظمت غالب، ۲۳۔ قرآن کا فلسفۂ تاریخ، ۲۴۔ اقبال کا نظریۂ خودی، ۲۵۔ ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش، ۲۶۔ قرۃ العین حیدر کا فن، ۲۷۔ اقبال کا ذہن وفنی ارتقا، ۲۸۔ ٹیپو سلطان، ۲۹۔ The way of Islam، ۳۰۔ Iqbal The Poet، ۳۱۔ اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ، ۳۲۔ قرآن کیوں پڑھیں؟ ۳۳۔ قرآن کا نظریہ کائنات، ۳۴۔ محمود غزنوی، ۳۵۔ تنقیدی زاویے، ۳۶۔ ہندستان کے لیے مستقل کا نقشۂ عمل، ۳۷۔ فروغ تنقید، ۳۸۔ غالب کا فن، ۳۹۔ میر کا تغزل، ۴۰۔ Islam and Terrorism، ۴۱۔ تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ، ۴۲۔ فیض کی شاعری، ۴۳۔ بہار میں اردو کا سرکاری استعمال، ۴۴۔ Translation of the Quran، ۴۵۔ An approach to World History، ۴۶۔ انداز تنقید۔

پروفیسر عبدالمغنی کا نظریۂ ادب

"ادب میرا پہلا عشق رہا ہے اور میں اُس کو تزئینِ حیات کا بہت بڑا وسیلہ سمجھتا ہوں، اور میرا خیال ہے کہ جس معاشرے کا ادب خراب ہوجاتا ہے اس کے دل ودماغ بھی سلامت نہیں رہتے... جس قوم کی شاعری، افسانہ، ڈرامہ، ناول اور تنقید مریضانہ ہوں، اُس قوم کو کسی بھی طور صحت مند نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ ان ہی خیالات نے ۱۹۵۲ء میں مجھے تنقید ادب کی طرف مائل کردیا"۔

"میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ اسی کا ایک جُز ہے اور اسی کی تشریح وتزئین کے لیے لکھا جاتا ہے، لہٰذا ادب کو لازماً اقدارِ حیات کا پابند ہونا چاہیے۔

ادب کے نام پر پیش کی جانے والی ہر وہ چیز غلط ہے جو ثقافت، تہذیب اور زندگی کے اقدار واصول اور آداب سے ٹکرانے والی اور ان کی تردید وتخریب کرنے والی ہو، چناں چہ ادب میں

جمالیات کا کوئی تخیل اخلاقیات سے بیگانہ نہیں ہوسکتا؛ بلکہ اخلاقیات سے بے نیاز ہوکر جمالیات کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا ہے۔ فحاشی اور بدکاری کو کتنے ہی خوب صورت پردوں میں پیش کیا جائے، ان کی کراہت اور قباحت کو گوارا نہیں بنایا جاسکتا۔ خوش نمائی بغیر کسی خوبی کے فریب محض ہے، جس سے تسکین ومسرت کا احساس کسی صحت مند ذہن کو نہیں ہوسکتا"۔ ("معیار واقدار" ص:ب)

"آزاد نظم، آزاد غزل اور نثری شاعری میں شعریت کا قتل عام کیا گیا ہے۔ شاعرانہ احساسات تو نئے تجربات میں بکھرے ہوئے ہیں؛ لیکن انہیں شاعری کے سانچے میں ڈھالا نہیں جاسکا ہے"۔ ("بودھ دھرتی"، ۳۱ردسمبر ۱۹۸۹ء، صفحہ: ۸)

پروفیسر عبدالمغنی مشاہیر کی نظر میں

شمس الرحمن فاروقی:

"جدید ہندستان میں اردو کے لیے جدوجہد میں بہار نے رہنما کردار ادا کیا ہے اور اس کا اعزاز بڑی حد تک پروفیسر عبدالمغنی مرحوم کو جاتا ہے۔ اردو تنقید میں بھی انہوں نے ایک مخصوص روش اپنائی تھی اور وہ تازندگی اس پر گامزن رہے"۔

پروفیسر وہاب اشرفی:

"بنیادی طور پر عبدالمغنی مشرقی افکار کے نقاد ہیں۔ انہیں اگر کلیم الدین احمد کی ضد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا؛ لیکن کلیم الدین احمد کے یہاں تدلیلی انداز ہوتا ہے، عبدالمغنی زیادہ تر اپنی ذاتی رائے پر اعتبار کرتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ عبدالمغنی اپنے طرز کے انوکھے اور منفرد نقاد ہیں، جن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز سب سے الگ ہے"۔

شہباز حسین: (سابق مدیر روزنامہ 'آجکل'، دہلی)

"وہ ایک عظیم ناقد، محقق اور صحافی تھے، ان کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ 'مریخ' ایک باوقار علمی رسالہ تھا۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود ان کی انسان دوستی اور کسر نفسی میں فرق نہیں آیا"۔

عہدے اور اعزازات

- للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے سرفراز کئے گئے۔
- انجمن ترقی اردو بہار کے ریاستی صدر کے عہدہ پر تاعمر فائز رہے۔

❀ حلقۂ ادب بہار کے ترجمان رسالہ ماہنامہ 'مریخ' کے تاعمر مدیرِ اعلیٰ رہے۔

— اسلم جاوداں

ابتدائیہ

پروفیسر عبدالمغنی: ایک نظر میں

نام	:	ابوالمبرد سید عبدالمغنی
قلمی نام	:	عبدالمغنی
والد کا نام	:	مولانا سید عبدالرؤف ندوی
وطن	:	اورنگ آباد، بہار
تاریخ پیدائش	:	4 جنوری 1936ء
تاریخ وفات	:	5 ستمبر 2006ء
تدفین	:	شاہ گنج قبرستان، پٹنہ
اورنگ آباد سے پٹنہ منتقلی	:	1949ء
درجہ مولوی میں داخلہ	:	مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ 1949ء
عالم	:	بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ 1953ء
بی اے انگریزی آنرز	:	1958 پٹنہ یونیورسٹی

ایم اے انگریزی	:	1960ء پٹنہ یونیورسٹی
لکچرر کی حیثیت سے تقرر	:	1961ء پٹنہ یونیورسٹی
پی ایچ ڈی	:	1978ء پٹنہ یونیورسٹی
یونیورسٹی پروفیسر	:	1996ء
ملازمت سے سبکدوشی	:	جنوری 1996ء بحیثیت انگریزی پروفیسر
وائس چانسلر	:	ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (جولائی 1996ء سے مئی 1999ء)
صدر انجمن ترقی اردو بہار اور صدر حلقہ ادب بہار	:	1975 سے تاحیات (یعنی 31 سال صدر رہے)
اعزازات وایوارڈ	:	(۱) غالب ایوارڈ، ایوان غالب، نئی دہلی 2000ء (۲) شکھر سمان، راج بھاشا، حکومت بہار 2000ء

تصنیفات وتالیفات

(1) نقطۂ نظر : 1965
(2) جادۂ اعتدال : 1972
(3) ہندوستان میں مسلم اقلیت کا مسئلہ : 1972
(4) برناڈ شا : 1976
(5) تشکیل جدید : 1976
(6) معیار واقدار : 1981
(7) اقبال اور عالمی ادب : 1982
(8) اقبال کا نظام فن : 1985
(9) T.S.Eliots Concept of Culture 1986
(10) تنقید مشرق : 1987
(11) طرز تعلیم : 1987

(12) قرآن کا تصور حسن : 1987
(13) تصورات : 1988
(14) مابعد صنعتی معاشرہ اور اسلام : 1988
(15) مولانا ابوالکلام آزاد۔ ذہن وکردار : 1989
(16) دہشت پسندی اور اسلام : 1989
(17) مولانا مودودی کی ادبی خدمات : 1989
(18) قرآن مجید کا ادبی اعجاز : 1989
(19) اسلوب تنقید : 1989
(20) Islamic Civil Code : 1989
(21) تنویر اقبال : 1990
(22) عظمت غالب : 1990
(23) قرآن کا فلسفہ تاریخ : 1990
(24) اقبال کا نظریہ خودی : 1990
(25) ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش : 1991
(26) قرۃ العین حیدر کا فن : 1991
(27) اقبال کا ذہنی اور فنی ارتقاء : 1991
(28) ٹیپو سلطان : 1991
(29) The Way of Islam : 1992
(30) Iqbal the poet : 1992
(31) اورنگ زیبؒ : 1992
(32) قرآن کیوں پڑھیں : 1992
(33) قرآن کا نظریہ کائنات : 1993
(34) محمود غزنوی : 1993

(35) تنقیدی زاویے : 1993

(36) ہندوستان کے لیے مستقبل کا نقشۂ عمل : 1994

(37) فروغ تنقید : 1998

(38) غالب کا فن : 1999

(39) میر کا تغزل : 2000

(40) Islam and Terrorism : 2000

(41) تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ : 2001

(42) فیض کی شاعری : 2001

(43) بہار میں اردو کا سرکاری استعمال : 2008

(مرتب: ڈاکٹر مسعود)

پروفیسر عبدالمغنی: ایک تعارف

یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پروفیسر عبدالمغنی کا پورا نام ابوالمبر دسید عبدالمغنی تھا۔ وہ پوری ادبی اور لسانی دنیا میں عبدالمغنی کے نام سے جانے پہچانے گئے۔ اُن کا انتقال 5 ستمبر 2006ء کو 70 سال کی عمر میں پٹنہ کی نیو عظیم آباد کالونی میں ہوا۔ نماز جنازہ جامع مسجد، درگاہ شاہ ارزاں کے احاطے میں ہوئی اور شاہ گنج قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ مجھے جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر ملی تو میں نے ڈاکٹر محمد عبدالواحد انصاری (سابق نائب صدر اور پروفیسر آر پی ایم کالج، پٹنہ سیٹی شعبۂ انگریزی) کے ساتھ اُن کے مکان (نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ) کا رخ کیا۔ ہم دونوں صبح تقریباً 9 بجے ان کے گھر پہنچے۔ پروفیسر عبدالمغنی سکون کے ساتھ ابدی نیند سوئے ہوئے تھے۔ عبدالواحد صاحب نے اُن کے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور ہم دونوں اُن کا آخری دیدار کر کے آبدیدہ ہوگئے۔ عبدالواحد صاحب نے عقیدت سے اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا؛ بلکہ اُسے چوما بھی۔ کچھ دیر ہم دونوں غمگین وہاں کھڑے رہے اور ان کے پُرسکون چہرے کو بغور دیکھتے رہے، جس وقت ہم لوگ ان کے گھر پہنچے، اُس وقت ان کے انتقال کو تقریباً چار گھنٹے ہوگئے تھے۔ اردو حلقے میں ان کے انتقال کی خبر پھیل چکی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر وہاں رُکے اور پھر گھر چلے آئے؛ کیوں کہ ظہر کی نماز کے بعد درگاہ شاہ ارزاں کی مسجد کے احاطے میں نماز جنازہ ہونے والی تھی اور تدفین شاہ گنج قبرستان میں ہونی تھی، جو سہیل عظیم آبادی اور کیف عظیم آبادی سمیت کئی قلم کاروں کی آخری آرام گاہ ہے۔ ہم لوگ

ظہر کی نماز سے قبل دوبارہ پروفیسر عبدالمغنی کے مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں اردو والوں کی تعداد بہت مایوس کن تھی۔ قابل ذکر لوگوں کی تعداد اور بھی کم تھی، جس وقت نماز جنازہ ہوئی، اس وقت دو تین سو لوگ ہی ہوں گے۔ تدفین کے وقت یہ تعداد اور بھی کم تھی۔ محسوس ہی نہیں ہوا کہ اردو زبان و ادب اور اردو تحریک کی کوئی عظیم المرتبت شخصیت ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی ہے۔ اردو والوں کی مجرمانہ غفلت کا احساس وہاں موجود سبھی لوگوں کو ہوا اور پروفیسر عبدالمغنی کی نماز جنازہ اور تدفین کے وقت شرکاء کی مایوس کن تعداد نے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ٹھیک اُسی جگہ پروفیسر عبدالمغنی کے انتقال کے دس (۱۰) سال کے بعد مجھے ایک خاتون ڈاکٹر کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کا موقع ملا تو دیکھا کہ وہاں لوگوں کا ہجوم ہے، کوئی ایسی قابل ذکر سماجی، ادبی، لسانی، سیاسی، مذہبی اور ادبی شخصیت نہیں تھی، جو وہاں موجود نہ تھی۔ ہر قابل ذکر شخصیت اُس خاتون کی نماز جنازہ اور تدفین میں نظر آئی۔ یہ خاتون کوئی معروف ادیب، شاعرہ، یا سیاست داں نہیں تھیں۔ وہ کوئی بہت مشہور ڈاکٹر بھی نہیں تھیں۔ اُن کا تشخص صرف یہ تھا کہ وہ ایک مشہور اور مضبوط آئی اے ایس افسر کی اہلیہ تھیں۔
اُس وقت اچانک میرے ذہن کے پردے پر دس سال پیچھے کا منظر گھوم گیا اور میں قبرستان سے زبردست ذہنی بوجھ لے کر گھر واپس آیا اور سوچتا رہا کہ مسلمان تو حق پسند ہوتا ہے، کسی کا پجاری نہیں ہوتا تو پھر وہ اپنے مخلصوں کو فراموش کر کے اقتدار کی پوجا کیوں کرتا ہے؟ تقریباً یہی صورتِ حال قائد اردو الحاج غلام سرور (انتقال اکتوبر 2004ء) کی نماز جنازہ اور تدفین کے وقت بھی تھی۔ اگر وہ وزیر نہ ہوتے اور اُن کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہ ہوتا تو اُن کی میت میں پچاس آدمی بھی نہیں ہوتا۔ پروفیسر عبدالمغنی کو ہم سے رخصت ہوئے بارہ تیرہ سال ہوگئے اور ان کے ساتھ بہار میں عوامی سطح پر اردو تحریک بھی ختم ہوگئی؛ بلکہ ہر طرح کی تحریک ختم ہوگئی۔

پروفیسر عبدالمغنی 4 جنوری 1936ء کو اورنگ آباد (بہار) میں پیدا ہوئے اور 1949ء میں 12 سال کی عمر میں اورنگ آباد سے پٹنہ منتقل ہوگئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں حاصل کی۔ ان کے والد مولانا سید عبدالرؤف ندوی عالم دین تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی ''غبار کارواں'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ 1949ء کی بات ہے جب میں بارہ سال کی عمر میں اپنے وطن اورنگ آباد (بہار) سے پٹنہ آکر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے درجہ مولوی میں داخل ہوا؛ تاکہ اپنے

والد مولانا سید عبدالرؤف ندوی کی مرضی کے مطابق عالم دین بن کر قاضی و امام جامع مسجد کے قدیم خاندانی منصب پر ان کی جانشینی کروں، چناں چہ 1953ء میں بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے امتحان میں اوّل آکر میں عالم تو باضابطہ بن گیا؛ مگر مدرسے کے ناگفتہ بہ حالات کے سبب میٹرک کا پرائیوٹ امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر کے مدرسے کے امتحان میں اوّلیت کا سرکاری وظیفۂ لیاقت لے کر پٹنہ یونیورسیٹی کے انٹرمیڈیٹ آرٹس میں داخل ہوگیا اور اس کے فائینل امتحان میں بھی وظیفۂ لیاقت حاصل کر کے بی اے کے انگریزی آنرز کا طالب علم بن گیا، پھر 1960ء کے اواخر میں ایم-اے کرنے کے بعد 1961ء کے وسط میں بہار پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہو کر پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کا لکچرر بنا دیا گیا اور ترقی پاتا ہوا 1996ء میں یونیورسٹی پروفیسر کی حیثیت سے رٹائر ہوگیا.... کئی اسکالروں نے میری نگرانی میں کامیاب ریسرچ کر کے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ یونیورسٹی سے رٹائر ہونے کے چند ماہ بعد مجھے متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کا وائس چانسلر بنا دیا گیا''۔

(''پروفیسر عبدالمغنی: حیات وخدمات'' مرتب ڈاکٹر سید احمد قادری، صفحہ۔9)

پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے ایک تفصیلی انٹرویو میں جو انہوں نے ڈاکٹر نسیم اختر (محقق اور ادیب) کو دیا تھا، تفصیل سے اپنے ابتدائی حالات بتائے ہیں۔ انٹرویو میں اُن سے پہلا سوال یہ کیا گیا تھا کہ ''آپ کی مذہبی تعلیم کا محرک کیا ہے؟'' اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

''.... میرے والد صاحب خود باضابطہ معلم، عالم دین تھے، محقق تھے، مصنف تھے۔ میں اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ ہمارے خاندان میں قاضی کا منصب مغلوں کے وقت سے چلا آرہا تھا۔ والد صاحب اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ وہ خود حافظ قرآن بھی تھے۔ عالم ہونے کے علاوہ شہر کے قاضی بھی تھے۔ غیر منقسم جمعیۃ علماء کے صدر تھے۔ امارت شرعیہ جب مولانا سجاد نے قائم کی تھی تو اس وقت دو تین مبلغ تھے امارت شرعیہ کے۔ ان میں وہ بھی تھے۔ اس پس منظر میں والد صاحب نے میری تعلیم خود شروع کی اور پہلے مجھے حفظ کرانے کی کوشش کی گئی۔ والد صاحب کو فرصت نہیں تھی اپنے کاموں کی وجہ سے؛ اس لیے ایک حافظ شریف صاحب تھے، ان کے حوالے مجھے کیا گیا؛ لیکن وہ بہت ضعیف تھے اور ذہنی طور پر بہت معذور ہوگئے تھے۔ بعد میں حفظ مکمل نہیں ہوا

تو پھر والد صاحب نے مجھے عربی اور فارسی پڑھائی، یہاں تک کہ بچپن میں ہی فارسی اور عربی سے میری اچھی خاصی واقفیت ہوگئی....''۔

(''باتیں'' ڈاکٹر نسیم اختر صفحہ-86)

ابوالبرد سید عبدالمغنی نے 1958ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے انگریزی میں بی-اے آنرز، 1960ء میں انگریزی میں ایم-اے اور 1978 میں "T.S. Eliot's Concept of Culture" کے موضوع پر پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ-ڈی کیا۔ 1961 میں پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ اس دوران انہوں نے بی این کالج پٹنہ اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں تدریسی ذمہ داریاں انجام دیں۔ 1985ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور جنوری 1996ء کو عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد انہیں حکومت نے جولائی 1996ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کا وائس چانسلر مقرر کیا۔ اس عہدے سے وہ مئی 1999ء کو سبکدوش ہوئے۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''نقطۂ نظر'' 1965ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی حیات تک اُن کی کئی علمی، ادبی اور تنقیدی کتابیں شائع ہوئیں جس کی تفصیل شروع میں دی گئی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی 1974ء سے تاحیات ''انجمن ترقی اردو'' اور ''حلقۂ ادب بہار'' کے صدر اور اس کے ترجمان ''مریخ'' کے ایڈیٹر رہے۔ ان کی ادارت میں برسوں تک یہ رسالہ شائع ہوتا رہا۔ اس نے بہار کی مجلّاتی صحافت کو معیار و وقار عطا کیا اور اردو ادب کو ایک خاص نہج پر چلنا سکھایا۔ پروفیسر عبدالمغنی آزاد نظم، آزاد غزل اور نثری شاعری کے سخت مخالف تھے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے جب ان سے ایک انٹرویو میں یہ سوال کیا کہ عصر حاضر کی اردو شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ:

> ''بہت برا خیال ہے۔ آزاد نظم، آزاد غزل اور نثری شاعری میں شعریت کا قتل عام کیا گیا ہے۔ شاعرانہ احساسات تو نئے تجربات میں بکھرے ہوئے ہیں؛ لیکن انہیں شاعری کے سانچے میں ڈھالا نہیں جاسکا ہے۔ اچھی شاعری اُسی وقت ممکن ہوگی، جب آزاد نظم نگاری، آزاد غزل گوئی اور نثری شاعری کو دریابرد کر کے پابند نظم نگاری، پابند غزل گوئی کی روایت کو فروغ دیا جائے''۔

(پروفیسر عبدالمغنی: حیات و خدمات'' از ڈاکٹر سید احمد قادری صفحہ-27)

پروفیسر عبدالمغنی نے بہت سادہ زندگی گذاری۔ رہائش بھی بہت سادہ رہی۔ نفاست اور قناعت اُن کی زندگی کا اٹوٹ حصہ تھی۔ طہارت، پاکیزگی اور صفائی پر انہوں نے آخری وقت تک پوری توجہ دی۔ انہوں نے گھر اور گھر سے باہر نشست و برخاست کا ایک اصول وضابطہ بنا رکھا تھا، جس سے انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ گھر سے باہر شروانی اور ٹوپی اُن کے لباس کا حصہ تھی۔ پٹنہ یونیورسٹی احاطے میں سرکاری کوارٹر ملنے سے قبل وہ برسوں عالم گنج میں مین روڈ پر ''نورانی باغ'' کے قریب کرائے کے مکان ''وارثی کنج'' میں رہے۔ وہ عام آدمیوں کی طرح ٹمپو سے چلتے تھے۔ یونیورسٹی بھی اسی سے جاتے۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر (لیڈی امام ہاؤس، پتھر کی مسجد) جانے کے لیے بھی یہی سواری تھی۔ پروفیسر عبدالمغنی جب تک عالم گنج میں رہے ''دلان جی کی مسجد'' (جو مین روڈ پر ہے) میں جمعہ کا خطبہ دیتے رہے۔ ''ادبیات'' کے ساتھ ساتھ ''اسلامیات'' بھی اُن کا خاص موضوع تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پٹنہ کے عالم گنج میں مولانا سید شاہ اسماعیل روحؒ، مولانا حکیم سید شاہ تقی حسن بلخیؒ، پروفیسر عبدالحئی، ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ (سابق امیر جماعت اسلامی ہند، بہار)، مولانا اصغر امام فلسفی (ایڈیٹر ''نقیب''، پھلواری شریف) بھی رہتے تھے۔ یہ تمام علمی شخصیتیں اپنی خوشبو پھیلا کر راہی ملک عدم ہوچکی ہیں۔ اس وقت عالم گنج میں صرف ایک بزرگ عالم دین مولانا حکیم سید شاہ علیم الدین بلخی (سجادہ نشیں خانقاہ بلخیہ فردوسیہ، فتوحہ، پٹنہ) حیات ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی اور ان میں کافی قربت رہی؛ کیوں کہ برسوں تک دونوں پڑوسی رہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا حکیم علیم الدین بلخی جب جمعہ کی نماز میں دلان جی مسجد میں موجود ہوتے تو عبدالمغنی صاحب خطبہ نہیں دیتے۔ خطبہ کے لیے بلخی صاحب کو ہی آگے بڑھاتے۔ دونوں بزرگ ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔ میری اہلیہ سلمیٰ بلخی (بنت حکیم سید شاہ علیم الدین بلخی) پروفیسر عبدالمغنی کی شاگردہ رہی ہیں۔ انہوں نے ان سے انگریزی پڑھی ہے۔ مجھے مذکورہ تمام بزرگوں کا خطبہ سننے کا شرف حاصل ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی بھی بہت اچھے خطیب تھے۔ سیرت النبیؐ پر بھی وہ بہت عمدہ تقریر کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰؒ کے شاگرد خاص شاہد انور نے مجھے بتایا کہ جلسۂ سیرت سے خطاب کرنے کے لیے پروفیسر عبدالمغنی بہار سے باہر بلائے جاتے تھے۔ بنارس (یوپی) سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں کے حوالے سے برادرم شاہد انور نے بتایا کہ بنارس کے لوگ پروفیسر عبدالمغنی کے بڑے مداح تھے۔ سیرت النبیؐ پر ان کے خطبے سننے کا انہیں اکثر موقع ملا۔ حج اور پٹرول کی اہمیت کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی نے جو

خطبہ دیا، اُس کا مفہوم شاہد انور کو آج بھی یاد ہے۔ شاہد انور کہتے ہیں کہ جمعہ کے ایک خطبہ کے دوران پروفیسر عبدالمغنی نے خانہ کعبہ کو ''شمع'' اور عازمین حج کو ''پروانہ'' کے طور پر پیش کر کے طواف کعبہ کی جو منظر کشی کی، وہ لاجواب تھی۔ جس طرح پروانے شمع کی طرف بے قرار اور بے چین ہو کر کھنچے چلے آتے ہیں، اُسی طرح پوری دنیا سے مسلمان پروانہ کی شکل میں دیوانہ وار خانۂ کعبہ کی طرف جب رواں دواں ہوتے ہیں تو منظر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ شاہد انور کہتے ہیں کہ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے خطبہ میں خاص انداز میں اس کی منظر کشی کی، جس سے سماں بندھ گیا۔ اِسی طرح اپنے ایک جمعہ کے خطبہ میں پروفیسر عبدالمغنی نے دنیا میں پٹرول کی اہمیت کو بھی موضوع بنایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پٹرول کی شکل میں بڑی دولت دی ہے، جس طرح جسم میں خون کی اہمیت ہے اور انسان اس کی بدولت رواں دواں ہے، اُسی طرح دنیا کی ترقی میں پٹرول کی بھی اہمیت ہے، جس طرح خون کم ہو جائے، یا رُک جائے تو انسان مرجاتا ہے، اُسی طرح پٹرول روک دیا جائے، یا ختم ہو جائے تو پوری دنیا کی ترقی رُک جائے گی؛ اس لیے عالم اسلام اور مسلمانوں کو اللہ کی اس نعمت کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی پوری زندگی اسلامی تشخص کے ساتھ گذاری جہاں کہیں بھی اُنہیں محسوس ہوا کہ اسلامی قدریں پامال ہو رہی ہیں تو انہوں نے اس کا ضرور نوٹس لیا اور تقریر و تحریر سے نہ صرف اس کی نشاندہی کی؛ بلکہ ان قدروں کو بچانے کی حتی الامکان کوشش بھی کی۔ پروفیسر عبدالمغنی فکری طور پر بانی جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر عبدالمعز منظر نے ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا، جو سہ روزہ ''دعوت'' (دہلی) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے پروفیسر عبدالمغنی کی اسلام پسندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اسلام ان کا (پروفیسر عبدالمغنی) مشن (Mission of life) تھا، جس کی حرارت سے ان کی شخصیت گرمی اور روشنی حاصل کرتی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اپنے آخری زمانہ میں موجودہ انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر تفسیر ہے، جو اب تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ بے شمار اسلامی موضوعات پر ان کی تصانیف اور تحریریں بھی اسی سوز دروں کی عکاس ہیں۔ فکر کی دنیا میں وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے

سب سے زیادہ متاثر تھے؛ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے ذہن و دماغ پر مولانا مودودیؒ پوری طرح حاوی تھے۔ اس کا اعتراف انہوں نے کھل کر اپنی تحریروں میں بار بار کیا ہے اور مولانا کی ایک ایک کتاب کی خوبیوں کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ وہ مولانا کو اس دور کا سب سے بڑا اسلامی مفکر ہی نہیں؛ بلکہ اسلام کا سب سے بڑا علمبردار اور زبان و ادب کا بے مثال خادم بھی مانتے تھے''۔

(''آسماں تیری لحد پر گوہر افشانی کرے''، مضمون: ڈاکٹر عبدالمعز منظر)

پروفیسر عبدالمغنی کی خود اعتمادی بھی مشہور تھی اور ''انا'' بھی۔ شبر امام (کئی کتابوں کے مصنف اور ادیب) نے بھی اُن کے انتقال کے بعد ایک مضمون لکھا تھا، جس میں انہوں نے پروفیسر عبدالمغنی کی خود اعتمادی کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''.... وہ (عبدالمغنی) حد سے زیادہ خود اعتمادی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، اس خود اعتمادی کا تعلق جہاں تک ان کی ذات سے تھا، وہ کامیاب اور سر بلند رہے۔ اس خود اعتمادی کا تعلق کسی دوسری ذات سے وابستہ ہوتا تو انہوں نے ہمیشہ دھوکا کھایا۔ یہ حادثہ کئی بار ہوا تھا، اس کے باوجود بھروسہ کرتے تھے؛ کیوں کہ اُنہیں خود پر اعتماد تھا۔ وہ زمانہ شناس سے زیادہ خود شناس تھے۔ وہ اردو زبان و ادب کے فروغ وارتقا کے سلسلے میں ہر ایک کے وعدے پر بھروسہ کر لیتے تھے، جس کی مثال انجمن ترقی اردو، بہار کی گذشتہ چند سال کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلے میں کافی صدمہ رہا۔ وہ صرف اور صرف مسلمان تھے اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے رہتے تھے''۔

(مضمون ''ایک ستون گرا، ایک چراغ اور بجھا''، از: شبر امام)

پروفیسر عبدالمغنی ایک ایسے ادیب، ناقد، خطیب، تحریک کار، صحافی اور قلم کار تھے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی ایک خاص انداز میں گذاری۔ ان کی اپنی ایک سوچ، اپنی ایک فکر اور اپنا ایک اسلوب تھا۔ حق گوئی اور بے باکی اُن کی وہ خوبیاں تھیں، جو بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں، جن لوگوں نے بھی اُنہیں دیکھا ہے، یا اُن کے ساتھ رہے ہیں، اُن تمام لوگوں کی متفقہ رائے یہی ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی ایک مخلص مجاہد اردو تھے، صاحب طرز ادیب تھے، نفاست اُن کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی تھی،

ان کے جینے اور زندگی گذارنے کا اپنا خاص انداز تھا۔سنجیدگی اور متانت اُن کی خاص پہچان اور شناخت تھی۔شبر امام نے اپنی کتاب ''شخصیت اور کردار'' میں پروفیسر عبدالمغنی کا بہت ہی اچھا نقشہ کھینچا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبدالمغنی کا بولنا، چلنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، رہنا سہنا، لیٹنا اور سونا سب ایک نپے تلے اور اصول وضوابط کے پیمانے میں گھرا ہے اور یہ ان کی زندگی کے شب و روز کی فطرت اور عادت بن گئی ہے۔خوبی یہ پائی جاتی کہ وہ حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔ڈاکٹر عبدالمغنی وقت کے سخت پابند ہیں اور بعض وقت اس ہندوستانی عوام کے مزاج کے مطابق دوسروں کے لیے وہ تکلیف دہ ہو جایا کرتے؛ مگر اُنہیں اس کی فکر اور نہ ہی پرواہ ہوتی۔مثلاً اگر جلسہ میں انہیں مدعو کیا گیا تو وہ وقت کی پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے اور اگر انہیں صدارت، یا تقریر کرنی ہوتی تو وہ اسی پابندی سے شروع کرتے اور تقریر وغیرہ کر کے صاحب جلسہ سے اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو جاتے۔وہ اگر کسی سمینار اور سمپوزیم میں شریک ہوتے تو وقت کی پابندی کا لحاظ رکھتے اور وہاں کے منتظمین اور سامعین سے بھی وہ اس کی اُمید کرتے کہ وقت کی پابندی کریں گے۔وہ وقت کی پابندی کی بنیاد پر کسی وقت اور کسی حالت میں مصالحت کرنے کو تیار نہیں رہتے۔وہ زیادہ تر اپنی تقریر، یا مقالہ پڑھنے کے بعد جلسہ گاہ میں رُکتے نہیں اور قیام گاہ چلے آتے۔وہ اپنی ذاتی امور بھی اسی پابندی سے انجام دیتے''۔

(''شخصیت اور کردار''، از: شبر امام سنہ اشاعت 1993ء صفحہ:124)

پروفیسر عبدالمغنی کی خوبیوں، ان کی اسلامی فکر اور اردو تحریک سے ان کی وابستگی کے حوالے سے ایک جگہ گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمعز منظر نے اپنے ایک مضمون میں صحیح لکھا ہے کہ:

''فکر اسلامی اور اردو تحریک یہ دونوں اُن کا (عبدالمغنی) اوڑھنا بچھونا تھی اور ان دونوں سے اٹوٹ وابستگی نے مل کر ان کی شخصیت کا تانا بانا تیار کیا تھا۔وہ ایک اچھے نثر نگار اور ممتاز ناقد تھے اور اقبال اور اقبالیات پر اتھاریٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔اس کی بنیادی وجوہ دو ہیں: ایک تو اسلامی نظام فکر وعمل سے ان کی گہری وابستگی، دوسرے عربی، فارسی اور اردو ادبیات کا گہرا اور تنقیدی مطالعہ نیز انگریزی اور عالمی ادب سے ان کی گہری واقفیت''۔

(مقالہ ''میرے عزیز دوست: پروفیسر عبدالمغنی''، از: ڈاکٹر عبدالمعز منظر)

پروفیسر عبدالمغنی کے تعلق سے اپنی یادداشت قلم بند کرتے ہوئے اپنے ایک مختصر مضمون میں منیر سے تعلق رکھنے والے ماسٹر مقیم الدین منیری (رٹائرڈ ہیڈ ماسٹر) نے انہیں جس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔وہ ملاحظہ کیجئے۔وہ لکھتے ہیں:۔

''پروفیسر صاحب ایک ادنیٰ آدمی سے بھی بلا جھجھک ملتے تھے، اُنہیں ہر کس وناکس نہایت احترام کی نظر سے دیکھتا تھا، ہر مسلک کے لوگ ان کے قدرداں تھے، انگریزی ادب سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو ادب مرحوم کی رگ رگ میں پیوست تھا.... بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ آپ ہی کی دین ہے....''۔

پروفیسر عبدالمغنی کے ذہن وفکر کو کس نے جلا بخشی اس کا جائزہ لیتے ہوئے معروف ادیب اور قلم کار طیب عثمانی ندوی نے لکھا ہے کہ:

''عبدالمغنی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیک وقت مشرقی ادب، خصوصاً اردو فارسی ادبیات کے ماہرانہ اداشناس ہیں۔ساتھ ہی انگریزی ادبیات سے براہ راست واقفیت نے اُن کے ذہن وفکر کو جلا بخشی ہے۔اُن کے ادبیات کا مطالعہ وسیع، متنوع اور عالمانہ ہے، جس کا اندازہ ہر اُس شخص کو ہوگا، جو اس کتاب کا مطالعہ غیر جانب داری سے کرے گا۔عبدالمغنی نے 'اقبال۔ایک مطالعہ' کے جائزہ میں، اس میں اٹھائے گئے موضوعات، اقبال اور دانتے، اقبال اور ملٹن، اقبال کی طویل اور مختصر اردو نظمیں اور اقبال کی فارسی نظمیں کے عنوان سے اقبال کے فکر وفن کا ایک ایسا مطالعہ پیش کیا ہے جو اردو تنقید میں نیا اضافہ ہے''۔

(''پروفیسر عبدالمغنی حیات اور خدمات'' ڈاکٹر سید احمد قادری، صفحہ: 41، مقالہ از: طیب عثمانی ندوی)

عصر حاضر کی اردو شاعری کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی کا خیال اچھا نہیں تھا۔اُن کا کہنا تھا کہ شاعرانہ احساسات کو شاعری کے سانچے میں نہیں ڈھالا گیا۔ڈاکٹر سید احمد قادری نے ایک انٹرویو کے دوران ان سے پوچھا کہ عصر حاضر کی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو پروفیسر عبدالمغنی نے فرمایا:

''بہت برا خیال ہے۔آزاد نظم، آزاد غزل اور نثری شاعری میں شعریت کا قتل

عام کیا گیا ہے۔شاعرانہ احساسات تو نئے تجربات میں بکھرے ہوئے ہیں؛لیکن اُنہیں شاعری کے سانچے میں ڈھالا نہیں جاسکا ہے۔اچھی شاعری اُس وقت ممکن ہوگی، جب آزاد نظم نگاری، آزاد غزل گوئی اور نثری شاعری کو دریا برد کر کے پابند نظم نگاری، پابند غزل گوئی کی روایت کو فروغ دیا جائے''۔

(''پروفیسر عبدالمغنی: حیات اور خدمات'' از: ڈاکٹر سید احمد قادری، صفحہ:27)

اس طرح پروفیسر عبدالمغنی کی زندگی ایک خاص نصب العین کی پابند رہی۔انہوں نے جو مقصد حیات طے کیا تھا، اُس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔انہوں نے آخر وقت تک اپنے ادبی نظریہ اور اسلامی فکر سے سمجھوتہ نہیں کیا۔اپنے سخت موقف کی وجہ سے حالانکہ اُنہیں تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن وہ اپنے موقف پر آخر وقت تک قائم رہے اور حلقہ ادب بہار کے رسالہ ''مریخ'' کے صفحات کو بھی اپنے موقف کا پابند بنائے رکھا۔اردو ادب کو گمرہی سے بچایا اور اسے صراط مستقیم پر چلنا سکھایا۔یہ اُن کا بڑا کارنامہ ہے جسے ادبی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔

پروفیسر عبدالمغنی: دو تحریکات کے آئینے میں

پروفیسر عبدالمغنی بہار کے اُن سپوتوں میں سے ہیں، جو اپنی نمایاں ادبی خدمات اور بہار میں اردو تحریک کے حوالے سے پوری ادبی اور لسانی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔وہ بہار میں اردو تحریک کے سپہ سالار ہی نہیں تھے؛ بلکہ اردو کے بڑے نقاد، مصنف، دانشور، ادیب اور مفکر بھی تھے۔بہار میں اردو تحریک شیر بہار الحاج غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت میں ہی پروان چڑھی۔اِن دونوں بزرگوں نے اردو والوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے سرفروشی کا جذبہ پیدا کیا اور اپنی مادری زبان اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے سیاسی رہنماؤں اور حکمرانوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں۔پروفیسر عبدالمغنی اپنی انانیت کے لیے بھی مشہور تھے۔اُن کا مزاج مذہبی تھا۔وہ شریعت کے پابند بھی تھے۔مشہور ادیب، شاعر اور مصنف ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے اس بیان سے ہر کوئی اتفاق کرے گا کہ:

''پروفیسر عبدالمغنی کی زندگی نہ صرف مذہبی تھی؛ بلکہ پابندیٔ شریعت کا مکمل نمونہ تھے۔کہہ سکتے ہیں کہ بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں؛ مگر ان کی شخصیت کا کوئی بھی جائزہ دو خصوصیات کا تذکرہ کیے بغیر نامکمل کہا جائے گا۔ایک تو اپنی مادری زبان سے ان کی بے لوث اور متواتر محبت اور دوسرے ان کی انانیت۔اردو زبان سے بے پناہ محبت کے سبب وہ بڑے سے بڑے مجمع میں کسی بھی ایسے شخص کو ٹوک دیتے تھے، جو اردو کے

خلاف کچھ بولنے، یا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ خواہ اس کا منصب کچھ بھی ہو۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری سے بعض حضرات خصوصاً سیاسی رہنما شاکی بھی رہے؛ مگر وہ ایک خاص انداز سے معاملات کو نپٹاتے رہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ انداز کسی خامی، یا کمزوری کی طرح نہیں؛ بلکہ توانائی کی صورت میں اُن کی شخصیت کا حصہ بنا رہا''۔

(''بہار کی بہار''عظیم آباد (بیسویں صدی میں جلد ا) از اعجاز علی ارشد، صفحہ 173 مطبوعہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)

پروفیسر عبدالمغنی کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جدیدیت کے نام پر اردو ادب میں کیے جانے والے نئے نئے تجربات کے منفی اثرات سے نہ صرف اردو کے ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کو ہوشیار کیا؛ بلکہ اس کے خلاف سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے جدیدیت کے خلاف اپنے موقف کو تحریک کی شکل دی۔ انہوں نے انجمن ترقی اردو بہار کے ادبی ادارے ''حلقۂ ادب بہار'' کے ترجمان ''مریخ'' میں مسلسل اداریے لکھ کر اور مضامین شائع کر کے اردو میں کلاسیکی ادب کے حق میں فضا بندی کی اور ادب کو غارت کرنے والی ادبی تحریک کے منفی اثرات سے قلم کاروں کو ہوشیار اور چوکس کیا اور اس تحریک کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے ترقی پسندی اور جدیدیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''حقیقت یہ ہے جس طرح ترقی پسندی مغربی ممالک سے درآمد کی گئی، اُسی طرح جدیدیت بھی درآمد کی گئی۔ پہلا رجحان روسی اشتراکیت کے زیر اثر ابھرا تھا تو دوسرا امریکی سرمایہ داری کے زیر اثر۔ دونوں صورتوں میں فکر و نظر کے پیمانے دیارِ غیر سے مستعار تھے''۔

(ماہنامہ ''مریخ'' شمارہ جنوری۔ اگست 1990ء، صفحہ:7)

انہوں نے تنقید نگاروں کو مغرب میں نہیں؛ بلکہ کلاسیکی ادب میں اپنی قدریں تلاش کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے لکھا:

''.... نئی تنقید کو بھی اپنی قدریں اپنے کلاسیکی ادب اور اس کی تہذیبی قدروں میں تلاش کرنی اور اس زبان میں گفتگو کرنی ہوگی جو اردو معاشرے کی جانی پہچانی اور مانی ہوئی زبان ہے''۔

(''مریخ''، ستمبر 1994ء، صفحہ:6)

پروفیسر عبدالمغنی نے ''ادب میں لغویات'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں لکھا:

''.... چند نااہل اور مفاد پرست افراد نے جدید اردو ادب میں لغویات کا ایک چکر چلایا، جس کا محرک و مقصود فقط اسٹنٹ بازی ہے۔ نئی نئی اصطلاحیں وضع کی جا رہی ہیں، جو سب کی سب انگریزی الفاظ کے ناقص ترجموں پر مشتمل ہیں اور مغربی ادبیات سے مستعار بھی۔ اسلوبیات اور ساختیات کے ڈھنڈورے پیٹے گئے اور جب یہ ایکٹ ناکام ہو گیا تو اب مابعد جدیدیت کا ناقوس پھونکا جا رہا ہے''۔

(''مریخ'' اگست۔ دسمبر 1997ء، صفحہ:3)

انہوں نے اردو والوں کو بتایا کہ مغرب کی نقالی میں اردو ادب میں جو نئے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں، اُس سے اردو ادب کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس خطرے سے اردو والوں کو باخبر کیا اور کہا:

''.... شاعری میں نظم آزاد، افسانے میں بے ماجرا، انشائیہ نگاری اور فلسفہ طرازی، یا لطیفہ گوئی، اسی طرح تنقید میں مغرب سے مستعار خیالات کی بھرمار اور پُر پیچ طرزِ بیان۔ یہ وہ تجربات ہیں، جو اردو ادب کے مستقبل کو غیر محفوظ بنا رہے ہیں''۔

(''مریخ''، مارچ۔ ستمبر 2004ء، صفحہ:5)

پروفیسر عبدالمغنی نے ادب میں نئے نئے تجربات کو سرطان سے تعبیر کیا۔ انہوں نے لکھا:

''.... آزاد نظم، بے ماجرا افسانہ اور ناول اور عجوبہ پسند تنقید نگاری وہ مہلک امراض ہیں، جو ادب کو سرطان کی طرح اندر سے کھا رہے ہیں''۔

(''مریخ''، مارچ۔ ستمبر 2004ء، صفحہ:5)

اس طرح پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی فکر کو تحریک کی شکل دی اور اردو ادب کو غارت ہونے سے بچایا۔ انہوں نے اسی طرح اردو کو اس کا قانونی حق دلانے کے لیے بھی پوری طاقت کے ساتھ لڑائی لڑی۔ انہوں نے اردو والوں، سیاست دانوں اور حکمرانوں کو اردو کے مسائل سے باخبر کیا اور پوری جرأت اور طاقت کے ساتھ ایوانِ حکومت میں اپنی باتیں رکھیں اور کسی سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کی جرأت اور بے باکی کا اندازہ اِس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ 8 جون 1989ء کو تاریخی شہر بہار شریف میں انجمن ترقی اردو بہار کی آل بہار اردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی، جس کی

صدارت پروفیسر عبدالمغنی کر رہے تھے۔ اس کانفرنس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے وزیر اعلیٰ ستندر نارائن سنہا شریک تھے۔ اُن کی موجودگی میں پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی تقریر میں بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اردو کے مسائل رکھے اور بھرے مجمع میں یہ کہہ دیا کہ:

"1980ء میں اردو کی سرکاری حیثیت کا قانون منظور ہونے اور 1981ء میں اس کا نفاذ شروع ہونے کے بعد پچھلے 8 سال میں حکومت نے اردو آبادی کے مسائل کے حل کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اُٹھایا ہے، خود قانون اردو کے نفاذ میں مشکلات ہو رہی ہیں، یہاں تک کہ ملازمین اردو کی شرح تنخواہ تک میں ضروری اضافہ نہیں ہوا ہے اور اقلیتی تعلیمی اداروں کو وقت پر پوری تنخواہ اور دیگر سہولتیں دیگر اداروں کے برابر نہیں مل رہی ہیں، لہٰذا اگر اردو بولنے والوں کے مسائل حل نہیں کیے گئے تو وہ انتخاب کے موقع پر اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے کانگریس کو ووٹ نہیں دیں گے"۔

("مریخ" جولائی۔اگست 1989ء، صفحہ۔71)

پروفیسر عبدالمغنی کی اس تقریر نے ستندر نارائن سنہا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے اردو آبادی کے مسائل کو معقول اور حق بجانب قرار دیتے ہوئے اُنہیں حل کرنے کا یقین دلایا۔ ستندر نارائن سنہا نے کہا:

"اردو آبادی کے مسائل کے حل کے لیے انجمن ترقی اردو، بہار نے جو مطالبات پیش کیے ہیں، وہ معقول ہیں۔ ان کی حکومت بہت جلد اس سلسلے میں انجمن سے باضابطہ مشورہ کرکے اپنے ضروری فیصلے کا اعلان کردے گی، جن میں بروقت کم از کم مزید دس (۱۰) اضلاع میں قانون اردو کا نفاذ بھی ہوگا اور اقلیتی تعلیمی اداروں کی مشکلات کا حل بھی"۔

("مریخ"، جولائی۔اگست 1989ء، صفحہ۔74)

پروفیسر عبدالمغنی کی اس جرأت اور بے باکی کا بہت مثبت نتیجہ برآمد ہوا اور حکومت نے بیس دنوں کے اندر 29 جون 1989ء کو 11 اضلاع میں اور 16 اگست 1989ء کو 13 اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اِس طرح متحدہ بہار کے 39 اضلاع میں اردو کو سرکاری مراعات حاصل ہوگئیں۔ یہ پروفیسر عبدالمغنی اور اُن کی ٹیم کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ آج بہار کے 38 اضلاع میں اردو سرکاری سطح پر پھل پھول رہی ہے۔ اِس وقت اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعہ

سرکاری سطح پر اردو کی معنویت بڑھ گئی ہے۔ پہلے عوامی سطح پر اردو کے لوگ متحرک تھے اور اردو زندہ تھی، اب سرکاری سطح پر اردو زندہ ہے اور اردو کے لوگ متحرک ہیں۔ مختلف اضلاع میں فروغ اردو سمینار اور اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والی بڑی شخصیتوں کی یاد میں تقریبات منعقد کر کے اسکول اور کالج سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک طلبہ وطالبات کو اردو سے جوڑا جارہا ہے، جس سے اُن کے اندر اپنی مادری زبان سے دلچسپی بیدار ہورہی ہے۔ ہر ضلع میں اردو زبان سیل ایک اردو افسر کی نگرانی میں سرگرم عمل ہے اور سرکاری سطح پر اردو کے عملی نفاذ کی مثبت کوششیں کی جارہی ہیں۔ اب تقریباً ہر محکمے میں اردو نظر آرہی ہے۔ اس طرح الحاج غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی، تقی رحیم، شاہ مشتاق احمد، مولانا بیتاب صدیقی، مولانا عثمان غنی، عبدالقیوم انصاری اور دوسرے اکابرین نے جو خواب دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر ہورہا ہے؛ لیکن ابھی بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑا کام اردو تحریک کو اُسی طرح زندہ اور متحرک کرنے کا ہے، جس طرح ان اکابرین کے دور میں یہ زندہ اور متحرک تھی۔ اسی طرح "حلقۂ ادب بہار" اور اس کے ترجمان "مریخ" پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے؛ تاکہ پروفیسر عبدالمغنی کا ادبی نقطۂ نظر پروان چڑھ سکے اور انہوں نے تنقید کا جو معیار قائم کیا تھا، اُسے آگے بڑھا کر نئی نسل تک پہنچایا جاسکے؛ لیکن بدقسمتی سے یہ کام عرصہ دراز سے رکا پڑا ہوا ہے۔ حلقۂ ادب بہار کی سرگرمیاں ٹھپ ہیں اور "مریخ" کی اشاعت بھی بند ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ اُن کے انتقال کے بارہ برسوں کے بعد بھی پروفیسر عبدالمغنی کے تعلق سے "مریخ" کا خصوصی شمارہ نہیں شائع ہوسکا، جب کہ اس کے لیے لوگوں نے مالی تعاون بھی دیا۔ معاملہ کہاں اٹک گیا ہے، اللہ کو ہی معلوم۔

بہار میں اردو تحریک اور پروفیسر عبدالمغنی

بہار میں اردو تحریک کی تاریخ اَسّی (80) سال پر محیط ہے؛ کیوں کہ اَسّی سال قبل ریاست میں اردو کی تخم ریزی کی گئی؛ یعنی 1938ء میں بہار میں اردو کا بیج بویا گیا۔ اس کے بعد اس کی مسلسل آبیاری کی گئی۔ یہ وہ سال ہے، جب پٹنہ کی سرزمین پر ہندوستانی کو قومی زبان بنائے جانے کے لیے سمجھوتہ ہوا تھا؛ یعنی بہار میں اردو تحریک کی تاریخ راجندر۔عبدالحق سمجھوتہ سے جڑی ہوئی ہے، اس سمجھوتہ پر 1938ء میں پٹنہ کے وہیلر سینٹ ہال میں (یہ تاریخی ہال آج بھی پٹنہ یونیورسٹی سے متصل اشوک راج پتھ پر موجود ہے) ناگری پرچار سبھا (ناگپور) کے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد اور انجمن ترقی اردو ہند (حیدر آباد دکن) کے جنرل سکریٹری مولانا عبدالحق کے درمیان ہوا تھا۔ اس تاریخی واقعہ پر بہار میں اردو کے سپہ سالار الحاج غلام سرور نے 4 اگست 1988ء کو اپنے ایک کتابچہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "50 سال پہلے بہار کے دارالسلطنت پٹنہ کے وہیلر سینٹ ہال میں راجندر۔عبدالحق سمجھوتہ پر دستخط ہوئے۔ سن 1938ء کا یہ واقعہ اردو تحریک کی تاریخ میں پورے برصغیر کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ عجیب اتفاق کہ اس تاریخی واقعہ کا سہرا بھی بہار کے سر بندھا، تب آنجہانی راجندر پرساد، ناگری پرچار سبھا (ناگپور) کے صدر اور مولانا عبدالحق مرحوم انجمن ترقی اردو ہند (حیدر آباد دکن) کے جنرل

> سکریٹری ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی راہ میں ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اب اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور ملک کا ہر طبقہ، ہر فرقہ، ہر علاقہ، ہر لسانی گروہ آزاد ہندوستان میں اپنے روشن مستقبل کا خواب دیکھنے لگا تھا۔ ہندی پریمی کہتے تھے کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان ہندی بہ خط دیوناگری ہوگی اور اردو والے کہتے تھے کہ اس کی حقدار اردو ہے۔ یہ بحث تلخ لہجہ اختیار کر رہی تھی کہ گاندھی جی نے بیچ کا راستہ ڈھونڈ نکالا اور یہ تجویز پیش کی کہ آزادی کے بعد ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی، جو دیوناگری اور فارسی دونوں لپیوں میں لکھی جائے گی اور یہی معاہدہ آج سے ٹھیک پچاس سال پہلے پٹنہ کے وہیلر سینٹ ہال میں راجندر پرساد اور عبدالحق کے درمیان ہوا جو راجندر۔حق پیکٹ کہلایا"۔

(بہار میں "اردو تحریک کے پچاس سال" از غلام سرور، صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، مطبوعہ 4 اگست 1988ء)

لیکن اس معاہدے کے باوجود ہندی بہ خط دیوناگری ملک کی قومی زبان بن گئی؛ کیوں کہ جنگ آزادی کے آخری برسوں میں اردو پر غیر ملکی اور پاکستانی زبان ہونے کا لیبل لگ چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 26 جنوری 1950ء کو ملک میں جو دستور نافذ ہوا، اس کی رو سے ہندی بہ خط دیوناگری ہندوستان کی قومی زبان قرار دے دی گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد ہی تھے، جنھوں نے مولانا عبدالحق کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی، جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں لکھی جائے گی؛ لیکن آزادی کے بعد یہ معاہدہ سیاست کی نذر ہو گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اردو کے کچھ مجاہدین اور انصاف پسند سیاست دانوں کی بدولت اردو ملک بدر ہونے سے بچ گئی اور دستور کی آٹھویں شیڈول میں 14 ملکی اور قومی زبانوں کی فہرست میں اردو بھی شامل کر لی گئی، اس طرح اردو کا کارواں آگے بڑھتا رہا اور لوگ جڑتے رہے۔

پھر 1951ء بہار میں اردو تحریک کے لیے نیا سنگ میل ثابت ہوا، جب غلام سرور کی سربراہی میں حلقۂ ادب بہار کی تشکیل ہوئی اور اس سے نوجوانوں کو جوڑا گیا، اسی کے زیر اہتمام انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) کی نگرانی میں مئی 1951ء میں بہار ریاستی اردو کانفرنس کا تین روزہ اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کی اور افتتاح بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ آنجہانی ڈاکٹر شری کرشن نے کیا۔ کانفرنس کی مجلس عاملہ کے چیرمین عبدالقیوم انصاری

(سابق وزیر) اور جنرل سکریٹری غلام سرور تھے۔ اسی اجلاس میں پہلی مرتبہ اردو والوں نے دستور کی دفعہ 347 کے تحت بہار میں سات مخصوص مقاصد کے لیے اپنے رسم خط کے ساتھ اردو کو سرکاری مراعات دیے جانے کی تجویز منظور کی گئی۔ اسی اردو کانفرنس کے اجلاس میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی گئی اور سردار محمد لطیف الرحمٰن (ایم ایل اے) اس کے پہلے صدر اور غلام سرور اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ یہ انجمن ترقی اردو ہند کی منظور شدہ شاخ تھی۔ جنوری 1952ء میں اردو کو علاقائی زبان؛ یعنی دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے لیے اسی انجمن کے زیر اہتمام دستخطی مہم شروع کی گئی۔ تقریباً 10 لاکھ 15 ہزار دستخط جمع ہوئے۔ 1954ء میں بہار میں اردو کنونشن منعقد ہوا اور 1956ء میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کی خدمت میں لیڈی انیس امام (ایم ایل سی) کی قیادت میں سوا دس لاکھ دستخطوں کے ساتھ ریاستی انجمن ترقی اردو کے وفد نے ایک عرضداشت پیش کی، جس میں مطالبہ کیا گیا کہ درج ذیل سات مقاصد کے لیے بہار میں اردو کو سرکاری طور پر استعمال کرنے کا قانونی حق دیا جائے۔

جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے، ان کو ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ دی جائے۔ بچوں کے سرپرست، یا والدین کا بیان کہ اس کی مادری زبان اردو ہے، اس کا قطعی ثبوت ہوگا۔

جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے، ان کو تعلیم کے ثانوی مدارج سے یونیورسٹی کے مدارج تک اردو پڑھنے کی سہولت پہنچائی جائے۔

جن اسکولوں میں کم سے کم بیس اردو پڑھنے والے لڑکے موجود ہوں، وہاں اردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔

پوری ریاست کی عدالتوں اور دیگر سرکاری محکموں میں اردو زبان اور اردو رسم خط کے استعمال کی اجازت دی جائے۔

مجالس قانون ساز میں اردو داں ممبران کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تقریر کر سکیں اور ایسی تقریروں کی رپورٹنگ اردو رسم خط میں کی جائے۔

تمام سرکاری اعلانات مثلاً الیکٹرول رول، راشن کارڈ، سالانہ اعداد وشمار کے گوشوارے اور پریس نوٹ، گزٹ وغیرہ جو عوام سے متعلق ہوں، وہ اردو زبان اور اردو رسم خط میں بھی شائع کیے جائیں۔

تمام سرکاری سائن بورڈ، نشانات جن کا مقصد عوام کو سہولت پہونچانا ہو، ان میں ہندی کے ساتھ اردو میں بھی لکھا جائے۔

پھر 1958ء میں دلّی کے پریڈ گراؤنڈ میں انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام آل انڈیا اردو کانفرنس ہوئی، جس کا افتتاح وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا اور صدارت تاراچند نے کی۔ کانفرنس میں وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے 75 رکنی قافلے نے انجمن کے صدر محمد ایوب ایڈوکیٹ کی قیادت میں شرکت کی۔ اس میں انجمن کے جنرل سکریٹری غلام سرور بھی تھے۔ الحاج غلام سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''یہیں مولانا نے اپنی زندگی کی آخری تقریر کی جس میں ملک کی اردو آبادی کی جانب سے یہ اقرار کیا کہ اب جب دستور ہند نے ہندی پر سرکاری زبان کی چھاپ لگا دی تو ہم تمام اردو والے اسے بہ سروچشم منظور وتسلیم کرتے ہیں۔ مولانا نے اسی تاریخی تقریر میں برملا یہ اعلان کیا کہ آزاد ہندوستان میں ہندی کو جو ملنا تھا اسے مل چکا؛ مگر اردو کو اس کی قرار واقعی جگہ ملنا ابھی باقی ہے''۔

(بحوالہ ''بہار میں اردو تحریک کے پچاس سال'' از: غلام سرور)

محمد ایوب ایڈوکیٹ کے بعد غلام سرور، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے صدر ہو گئے۔ اس قافلے میں پروفیسر عبدالمغنی کے ساتھ رامائن سنگھ، مولانا مفتی سید شاہ عثمان غنی، مولانا بیتاب صدیقی، شاہ مشتاق احمد، ہارون رشید، تقی رحیم، سید عرفان غنی، سید رضوان غنی اصلاحی اور کئی دوسرے لوگ شامل تھے۔ 1965ء میں پٹنہ میں ''بہار اردو کنونشن'' منعقد ہوا، جس میں اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دو سال کے اندر اردو کو اس کا حق نہیں دیا گیا تو اردو کو ''الیکشن ایشو'' بنایا جائے گا۔ اس وقت تک بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی اردو تحریک کا رشتہ عوام سے جڑ چکا تھا؛ یعنی اردو تحریک عوام کی تحریک بن چکی تھی۔ 1967ء کے اسمبلی انتخاب میں جب انجمن نے اردو کو الیکشن ایشو بنایا تو کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں نے اردو کے کاز کی حمایت کی؛ لیکن جن سنگھ اور کانگریس نے حمایت نہیں کی۔ (دیکھئے ''بہار میں اردو تحریک کے پچاس سال''۔ از غلام سرور 14 اگست 1989ء) انجمن کی اس تحریک کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اس وقت کے کانگریسی وزیر اعلیٰ کے بی سہائے کو شکست فاش ہوئی اور بہار میں مہامایا پرساد کی قیادت

میں نئی حکومت بنی۔ اردو کا قافلہ پروفیسر عبدالمغنی، غلام سرور، تقی رحیم، شاہ مشتاق احمد، مولانا بیتاب صدیقی، ہارون رشید اور ان کے دوسرے رفقا کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ پورا گروپ اردو کو اس کا قانونی حق دلانے کے لیے پورے بہار میں سرگرمی کے ساتھ رواں دواں رہا۔ جنوری 1968ء میں مہامایا پرساد کی حکومت ختم ہوگئی، پھر کانگریس کی حکومت بنی۔ اس کے بعد 1973ء تک یعنی تقریباً پانچ سال تک بہار میں سیاسی اتھل پتھل رہی۔ اس دوران تقریباً تین مرتبہ ریاست میں صدر راج نافذ ہوا اور کئی وزرائے اعلیٰ بدلے گئے۔ سیاسی خلفشار کے دوران ہی اردو کے حقوق کے لیے پروفیسر عبدالمغنی اور الحاج غلام سرور کی نگرانی میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ اسی دوران عبدالغفور وزیر اعلیٰ ہوئے۔ ان کی حکومت تقریباً دو سال (جولائی 1973ء سے اپریل 1975ء) رہی۔ یہ حکومت جے پرکاش نارائن تحریک کی نذر ہوگئی۔ 11 اپریل 1975ء کو ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کو آنجہانی اندرا گاندھی نے وزیر اعلیٰ بنایا۔ یہ وہ دور ہے جب اردو والوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کو توڑنے کی سازش شروع ہوئی؛ کیوں کہ اس انجمن میں پروفیسر عبدالمغنی اور ایک دو کو چھوڑ کر اکثریت کانگریس مخالف تھی، جن میں غلام سرور اور ان کے اخبار ''سنگم'' کا شمار صف اوّل میں ہوتا تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی جماعت اسلامی اور اس کی فکر سے قریب ہوتے ہوئے بھی کانگریس کے ہمدردوں میں تھے۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ انجمن ترقی اردو کے دستور کے مطابق انجمن کے عہدیداروں (صدر اور سکریٹری) کا انتخاب کانسلرس کرتے ہیں۔ اس کے لیے باضابطہ ممبر سازی ہوتی ہے اور ہر دو سو ممبر پر ایک کانسلر ہوتا ہے۔ میرا تعلق چوں کہ اُس زمانے میں پھلواری شریف سے تھا؛ اس لیے میں، میرے دوست ممتاز حسن عارفی (مرحوم) اور میرے کئی دوسرے رفقا پھلواری شریف سے کانسلر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب پھلواری شریف اور پٹنہ سیٹی میں انجمن کی شاخ بہت سرگرم تھی۔ پٹنہ سیٹی میں معین کوثر اور عبدالمعز کافی سرگرم کانسلروں میں تھے۔ 75-1974ء میں بھی ہم سب لوگ ممبر سازی کر کے کانسلر بنے تھے۔ ممبر سازی بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس وقت تک انجمن بہت مضبوط ہوگئی تھی اور حکومت وقت کے لیے سر درد بن گئی تھی۔ حالت یہ تھی کہ اردو کا حق لینے کے لیے محبان اردو سڑکوں پر آگئے تھے۔ پٹنہ سے لے کر مظفر پور تک اردو تحریک عوامی تحریک بن گئی تھی اور عوامی مظاہرے شروع ہوگئے تھے۔ اسی طرح کے ایک مظاہرے کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے لکھا ہے کہ:

''1972ء میں کانگریس پھر برسراقتدار آگئی، جناب عبدالغفور نے (جولائی 1973ء) میں وزیر اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ اسی دوران جے پی تحریک کا پھیلاؤ تیزی کے ساتھ ہونے لگا۔ اسی سال مظفر پور میں حقوق اردو کے لیے زبردست عوامی احتجاج ہوا۔ جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کی تحریک پر میں نے اردو دوستوں کا موثر حلقہ تیار کر لیا تھا۔ اردو کے لیے سڑکوں پر آنے کا معاملہ تھا۔ جلوس اور جلسے کی تاریخ کا اعلان ہوا اور میں پوری مضبوطی اور دلجمعی کے ساتھ پروگرام کو کامیاب بنانے میں مصروف رہا۔ پروفیسر اختر قادری مرحوم میری سرگرمیوں سے پریشان بھی تھے اور خائف بھی۔ میری سرگرمیاں گویا انٹی نیشنل تھیں، میں نے پروفیسر قادری صاحب سے گفتگو کے دوران یہ بھی کہا کہ میں مادری زبان کے حقوق کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہوں۔ یہ کوئی انٹی نیشنل رجحان تو نہیں ہے؛ مگر سچ یہ ہے کہ تقسیم ملک کے وقت کی آبادی اردو کا نام لینے سے گھبراتی اور ڈرتی تھی۔ بہرحال میں اپنی کوششوں میں لگا رہا۔ مرحوم عبدالقیوم لعل گنجوی، نور عالم خاں، احمد حسن، جمیل احمد ایڈوکیٹ، اصغر اعجازی ایڈوکیٹ سرگرم معاون رہے۔ ٹاؤن ہال سے جلوس نکلا اور شاہراہوں سے ہوتا ہوا ضلع مجسٹریٹ کے دفتر کے پاس ختم ہوا۔ 'اردو کا حق دو'، 'اردو ہندی بہنیں ہیں'، 'بہنوں میں سنگھرش نہیں' جیسے نعرے لگائے جاتے رہے۔ جناب غلام سرور، پروفیسر عبدالمغنی، سید شاہ مشتاق احمد، جناب بیتاب صدیقی وغیرہ حضرات پٹنہ سے تشریف لائے تھے اور جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ ضلع مجسٹریٹ کو میمورنڈم دیا گیا اور پھر تلک میدان میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا''۔

(''انجمن کی ان کہی باتیں''، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، بحوالہ ''تمثیل نو''، دربھنگہ۔ صفحہ۔ 45)

اسی طرح کا مظاہرہ پٹنہ شہر میں بھی غالباً 9 اگست کو اردو کے لیے ہوا تھا۔ اس مظاہرے میں میں نے اپنے پھلواری شریف کے رفقا کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ اس سے قبل اس کی تیاری کے سلسلے میں جگہ جگہ میٹنگ کی گئی تھی۔ ایک میٹنگ رام موہن رائے سیمنری (خزانچی روڈ، پٹنہ) میں بھی الحاج غلام سرور کی سربراہی اور نگرانی میں ہوئی تھی، جس میں اُن کے مذکورہ بالا رفقا بھی شامل تھے۔ اسی میٹنگ میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ایک جلسہ پھلواری شریف میں بھی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس جلسہ کی تیاری کی ذمہ داری انجمن کی پھلواری شریف شاخ کے ذمہ کی گئی۔

جلسہ کی تاریخ 5 اگست مقرر ہوئی۔ ہم لوگوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ اُس زمانے میں ''سنگم'' اور ''صدائے عام'' دو ہی پڑھے جانے والے اخبارات تھے۔ دونوں کی پالیسیاں الگ تھیں۔ ''سنگم'' کانگریس مخالف اخبار تھا اور ''صدائے عام'' کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کا حامی تھا۔ ایک کے ایڈیٹر الحاج غلام سرور اور دوسرے اخبار کے ایڈیٹر سید نظیر حیدر تھے۔ ''سنگم'' کا دفتر لالہ زار منزل، سبزی باغ میں اور ''صدائے عام'' کا دفتر پی ایم سی ایچ کے قریب اشوک راج پتھ پر ایک مکان کی بالائی منزل پر ہوا کرتا تھا۔ دونوں میں معاصرانہ چشمک چلتی رہتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ تاریخ مقررہ پر شام کو خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف کے حفظ خانہ میں جو خانقاہ سے متصل تھا، جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت میرے دادا مولانا سید شاہ محمد عثمان غنیؒ نے کی اور نظامت کا فریضہ میرے چھوٹے چچا سید رضوان غنی اصلاحی نے انجام دیا۔ جلسہ میں الحاج غلام سرور، مولانا بیتاب صدیقی، سید شاہ مشتاق احمد، کامریڈ تقی رحیم، ہارون رشید، ریاض عظیم آبادی وغیرہ موجود تھے۔ اس زمانے میں سید احمد کبیر جنہوں نے بعد میں پھلواری شریف سے ہفتہ روزہ ''امانت'' نکالا، پھلواری شریف میں ''صدائے عام'' کے نمائندہ تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ سید نظیر حیدر کی ایما پر سید احمد کبیر مرحوم نے غلام سرور کے اس جلسہ کو ناکام کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا۔ نتیجے کے طور پر جیسے ہی جلسہ شروع ہوا احمد کبیر صاحب پندرہ۔بیس آدمیوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ اس دوران ناظم جلسہ سید رضوان غنی اصلاحی صاحب نے تقریر کے لیے غلام سرور صاحب کے نام کا اعلان کیا۔ وہ تقریر کے لیے اُٹھ ہی رہے تھے کہ درمیان میں کھڑے ہو کر احمد کبیر صاحب نے کچھ بولنا چاہا تو اُن سے کہا گیا کہ جب غلام سرور بول لیں تو آپ کچھ بول لیے۔ انہوں نے جب شدت کے ساتھ اصرار کیا تو الحاج غلام سرور کے کہنے پر انہیں بولنے کی اجازت دے دی گئی۔ ہم لوگ اُن کے مزاج سے واقف تھے؛ لیکن اس کے پیچھے کوئی سازش بھی کام کر رہی ہے، اس کا علم ہم لوگوں کو نہیں تھا۔ اپنی تقریر کے دوران احمد کبیر صاحب نے شدت اختیار کر لی اور غلام سرور صاحب پر بھونڈے طریقے سے الزامات لگانے لگے اور لہجہ بھی بہت خراب ہو گیا۔ ہم لوگ انہیں سنجیدگی سے اپنی بات رکھنے کا مشورہ دیتے رہے۔ جب وہ نہیں مانے تو ہم لوگوں نے اُنہیں زبردستی روکنے کی کوشش کی۔ اس کے ردعمل میں وہ اور اُن کے رفقاء الحاج غلام سرور پر حملہ آور ہو گئے اور جلسہ ہنگامے اور افراتفری پر ختم ہو گیا۔ افراتفری میں غلام سرور کی چپل اِدھر اُدھر گم ہو گئی، میں نے انہیں اپنی چپل دے دی۔ اس کا ذکر

انہوں نے ''سنگم'' میں اپنے ایک اداریہ میں بھی کیا ہے۔ دوسرے دن ''صدائے عام'' میں سرخی لگی ''غلام سرور اور ان کی ٹولی پھلواری شریف میں جلسہ نہیں کر سکی۔'' اس جلسہ اور اس میں ہونے والی افراتفری اور سازش کے کئی گواہ اللہ کے فضل سے آج بھی حیات ہیں۔ اُن میں قوس صدیقی، اخلاق احمد قادری، جعفر امام مغنی، ڈاکٹر نصر الحق، عبدالغنی بھائی (عیسیٰ پور) اور رضی عالم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کارواں میں پھر بعد میں پروفیسر محمود نہسوی، فیروز احمد صدیقی، نجم الحسن نجمی اور کئی دوسرے نوجوان جڑے۔ بہر کیف مخالفت کے باوجود پٹنہ میں کمشنر کے دفتر کے سامنے اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے الحاج غلام سرور کی قیادت اور پروفیسر عبدالمغنی اور دوسرے رفقا کی عملی کوششوں سے اردو تحریک کی تاریخ کا یہ مظاہرہ کامیاب ہوا اور اس کی بازگشت ایوان حکومت تک سنی گئی۔ اس طرح بہار ریاستی انجمن ترقی اردو مضبوط ہوتی چلی گئی اور 1975ء تک پہنچتے پہنچتے اتنی مضبوط ہو گئی کہ حکومت وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے لگی۔... اور پھر یہیں سے قیادت کا جھگڑا بھی شروع ہو گیا۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو انتہائی نازک دور میں داخل ہو گئی اور سیاست کا شکار ہو کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

اسی سال یعنی 1975ء میں (غالباً مئی کی کسی تاریخ کو) جب کہ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا، بہار کے وزیر اعلیٰ تھے مظفر پور کے ٹاؤن ہال میں بہار ریاستی انجمن ترقی کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا، جس میں کانسلروں کو صدر اور سکریٹری منتخب کرنا تھا۔ صدر کے عہدے کے لیے غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی دونوں اُمیدوار تھے، جس کی وجہ سے زبردست تنازعہ پیدا ہو گیا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی اُمیدواری واپس لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس معاملے نے بہت سنگین شکل اختیار کر لی۔ مظفر پور کے ٹاؤن ہال میں صدر کی اُمیدواری کے تعلق سے کانسلر دو خیموں میں بنٹ گئے۔ ان میں ایک گروپ غلام سرور اور دوسرا گروپ پروفیسر عبدالمغنی کا حامی ہو گیا۔ اس واقعہ کو پروفیسر قمر اعظم ہاشمی نے اپنے مضمون ''انجمن کی ان کہی باتیں'' میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے! وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ سالانہ اجلاس وانتخاب نہایت تزک واحتشام کے ساتھ منعقد ہوا۔ بہار بھر سے نمائندگان انجمن سمٹ کر آ گئے۔ ٹاؤن ہال کے وسیع وعریض میدان میں شامیانوں اور خیموں کی تنصیب ہوئی۔ کچھ محبان اردو نے اپنے گھروں پر مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کیا اور مظفر پور کلب اور ہوٹلوں کے کمرے مخصوص کرائے گئے۔ دہلی سے ڈاکٹر

خلیق انجم بھی تشریف لے آئے۔ تجاویز کے اجلاس کے بعد انتخابی اجلاس ہونا تھا اور پھر شب میں مشاعرے کے انعقاد کا پروگرام تھا۔ تجاویز کے اجلاس ہی میں جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کا نظریاتی اختلاف نمایاں ہوگیا۔ دونوں حضرات عہدۂ صدر کے لیے اُمیدوار تھے۔ میرا رابطہ ان دونوں ہی حضرات سے تھا اور میں اس کوشش میں تھا کہ مفاہمت کی کوئی راہ نکل جائے۔ ہنگامہ آرائی نہ ہو، خون خرابہ نہ ہو۔ اس سے اردو مخالف کیمپ میں چراغاں ہوگا۔ پروفیسر اختر قادری صاحب انتخابی اجلاس کے صدر تھے۔ (''میرے خیال میں یہ بیان غلط ہے۔ انتخابی اجلاس شاہ مشتاق احمد صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا؛ کیوں کہ وہی اس وقت انجمن کے صدر تھے۔ ریحان غنی'') (یہ وہی پروفیسر اختر قادری صاحب تھے، جنھوں نے مجھے انجمن کی سرگرمیوں سے الگ رہنے کی تلقین کی تھی) میں نے ہی ان کا نام تجویز کیا تھا اور پروفیسر عبدالمغنی اور غلام سرور صاحبان نے اس کی تائید کی تھی۔ انتخابی اجلاس کے وقت ایوان کی گرمی کو دیکھ کر پروفیسر اختر قادری کچھ پریشان سے ہو گئے؛ کیوں کہ دونوں ہی حضرات (یعنی غلام سرور اور عبدالمغنی صاحب) صدارت کے خواہاں تھے اور دونوں کے حامیوں میں جوش وخروش تھا۔ میں نے عین اجلاس کے وقت پروفیسر اختر قادری سے مشورہ کیا کہ اگر یہ حضرات کسی کو ثالث مان لیں تو گاڑی نکل جائے گی''۔

پروفیسر قمر اعظم ہاشمی آگے لکھتے ہیں:۔

''پروفیسر اختر قادری صاحب نے اس کی حمایت کی اور تب میں جناب غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب سے ملا، یہ تجویز ان کے سامنے رکھی۔ ان حضرات نے سوال کیا کہ ثالث کون ہوگا؟ میرے ذہن میں پہلے سے کوئی نام نہ تھا؛ مگر فوراً ہی یہ بات ذہن میں آئی کہ ڈاکٹر ظفر حمیدی صاحب (گرچہ انجمن کی سرگرمیوں سے عملی طور پر کوئی تعلق نہیں رکھتے) غیر جانبدار اور اردو دوست ہیں، اب تک ان کو کچھ کہا نہیں گیا ہے اور نہ اُنھیں کچھ معلوم ہے۔ کیوں نا اُنھیں کا نام ثالثی کے لیے اختیار کر لیا جائے۔ صدارت کے دونوں اُمیدواروں نے اس تجویز کو مان لیا''۔

(''تمثیل نو''، دربھنگہ، صفحہ:48-47)

میں چوں کہ اس اجلاس میں پھلواری شریف اور پٹنہ سیٹی کے رفقا کے ساتھ موجود تھا، اس لیے میں بھی واقعہ کا عینی شاہد ہوں۔ یہ اجلاس شاہ مشتاق احمد صاحب کی صدارت میں منعقد ہو رہا تھا۔ قمر اعظم ہاشمی کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ پروفیسر اختر قادری اس اجلاس کے صدر نہیں تھے۔ بہرکیف اجلاس سے ایک روز پہلے ڈاکٹر ظفر حمیدی نے صدر کے دونوں اُمیدواروں سے ملاقات کر کے مفاہمت کی کوشش کی؛ لیکن بات نہیں بنی۔ دوسرے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق اجلاس شروع ہوا۔ صدر کے انتخاب سے قبل صدارتی عہدے کے دونوں اُمیدواروں غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی نے باری باری سے مائک پر آ کر ابتدائی گفتگو کے بعد اعلان کیا کہ ثالث کی بات اُنھیں قبول ہوگی۔ الحاج غلام سرور اس موقع پر اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنی جیب سے پنج سورہ نکال کر ثالث کی بات ماننے کا اعلان کر دیا، چوں کہ یہ کانسلروں کا اجلاس تھا اور تمام کانسلر اپنے خرچ سے آئے تھے؛ اس لیے اُن کا اصرار تھا کہ اُن سے حق رائے دہی کا اختیار نہ چھینا جائے اور دونوں اُمیدواروں کا باری باری سے نام پیش کر کے ایوان کی رائے لی جائے۔ ٹاؤن ہال میں موجود کانسلرس واضح طور پر دو خیموں میں بٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک خیمہ غلام سرور اور دوسرا خیمہ پروفیسر عبدالمغنی کو صدر بنانا چاہتا تھا۔ بہرکیف دونوں اُمیدواروں کی تقریر کے بعد ڈاکٹر ظفر حمیدی جو ثالث کا کردار ادا کر رہے تھے، مائک پر آئے اور دونوں اُمیدواروں کی خدمات کا ذکر کیا اور آخر میں ایوان کی رائے لیے بغیر پروفیسر عبدالمغنی کے صدر منتخب کیے جانے کا اعلان کر دیا۔ بس کیا تھا، غلام سرور خیمے میں آگ لگ گئی۔ ڈاکٹر ظفر حمیدی کے ہاتھ سے مائک چھین لیا گیا، کرسیاں چلنے لگیں۔ پورے ٹاؤن ہال میں بھگدڑ مچ گئی اور انتخابی اجلاس افراتفری پر ختم ہوگیا۔ صورت حال اتنی خراب ہوگئی کہ غلام سرور اور ان کے حامیوں کی جان کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ پٹنہ کے لوگ ٹاؤن ہال سے بھاگ کر کیمپ آفس پہنچے، شام ہو چکی تھی اور رات میں آل انڈیا مشاعرہ ہونے والا تھا۔ اُس وقت گاندھی سیتو نہیں بنا تھا، اسٹیمر چلتا تھا، ہم سب لوگ مشاعرہ میں شرکت کے بغیر کیمپ آفس سے کسی طرح رات میں سونپور پہنچے اور صبح سویرے پٹنہ آ گئے۔ ''صدائے عام'' دیکھا گیا، اُس میں سرخی لگی تھی ''پروفیسر عبدالمغنی انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب''۔ اس طرح مظفر پور کے ٹاؤن ہال میں اردو تحریک کی دو بڑی شخصیتوں کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوا، اُس نے آگے چل کر ایک بڑے تنازعہ کی شکل اختیار کر لی۔ غلام سرور اور اُن کے رفقا کا کہنا تھا کہ چوں کہ اجلاس افراتفری پر ختم ہوا، اس

لیے صدر کا انتخاب نہیں ہوا، جب کہ دوسری طرف ایک گروپ نے پروفیسر عبدالمغنی کو منتخب صدر تسلیم کرلیا۔ دونوں طرف سے قانونی چارہ جوئی شروع ہوگئی۔ دونوں اپنے اپنے دعوے پر اصرار کرتے رہے۔ اس دوران 8 اگست 1976ء کو انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ نے ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کے کنوینر سابق وزیر اعلیٰ عبدالغفور تھے۔ اس کمیٹی نے تنازعہ کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ 8 مئی 1977ء کو نئی مجلس عاملہ کی تشکیل ہوئی اور اس کا پہلا جلسہ 23 مئی 1977ء کو گورنمنٹ اردو لائبریری کی بالائی منزل میں ہوا، جس میں پروفیسر عبدالمغنی کو صدر، کلام حیدری کو جنرل سکریٹری اور ہارون رشید کو خازن بنائے جانے کے فیصلے پر اپنی مہر لگا دی اور انجمن ترقی اردو ہند نے بھی اس فیصلے کی توثیق کردی۔ اس فیصلے کو غلام سرور اور ان کے رفقا نے مسترد کردیا۔ اس طرح انجمن ترقی اردو دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت والی انجمن کا نام ''انجمن ترقی اردو بہار'' ہوگیا اور غلام سرور کی سربراہی والی انجمن کا وہی پرانا نام؛ یعنی ''بہار ریاستی انجمن ترقی اردو'' ہی رہ گیا، چوں کہ انجمن ترقی اردو ہند نے انجمن ترقی اردو بہار کو اپنی منظوری دے دی تھی؛ اس لیے حکومت بہار کا گرانٹ اُسے ہی ملنے لگا۔ اپریل 1977ء میں ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور بہار میں صدر راج نافذ ہوگیا۔ جون 1977ء میں یعنی تین مہینے کے اندر ہی صدر راج اُٹھالیا گیا اور سوشلسٹ رہنما کرپوری ٹھاکر کی قیادت میں بہار میں غیر کانگریسی حکومت بنی اور وزیر اعلیٰ کرپوری ٹھاکر نے اردو کے سپہ سالار غلام سرور کو اپنی کابینہ میں شامل کر کے محکمہ تعلیم اُن کے سپرد کردیا۔ اقتدار میں آجانے کے بعد غلام سرور ہر چند کہ اُس کا حصہ بن کر رہ گئے؛ لیکن انہوں نے اپنی ریاستی انجمن ترقی اردو کو بھی زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ اقتدار میں آنے کے بعد ''شیر بہار'' کی آواز مدھم ہوگئی اور وہ ''سیاست کے پنجڑے'' میں بند ہوگئے اور اردو کا یہ سپہ سالار جس نے 1951ء میں اردو کو اس کا قانونی حق دلانے کے لیے اپنا سفر شروع کیا تھا، 26 برسوں کے اندر یعنی 1977ء میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ اردو کے ایک مضبوط مجاہد کو کسی کی نظر لگ گئی، اردو تحریک یک رُخی ہوکر رہ گئی، جس سے اردو کو شدید نقصان پہنچا، یہ نقصان کس طرح پہنچا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ دوسری طرف پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت میں جو کارواں بنا، اُس نے اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ یہ وہی سال یعنی 1977ء تھا، جب اُس وقت کے وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی اور وزیر داخلہ چرن سنگھ نے دو الگ مقامات میں ملک میں کہیں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے

جانے کی مخالفت کی۔ وزیر اعظم ڈیسائی نے 31 مئی 1977ء کو لکھنو میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ!

''اردو کو کہیں بھی دوسری سرکاری زبان بنانے کا کوئی سوال نہیں''۔

(''مورچہ'' گیا، 9 جولائی 1977ء، بحوالہ ''پیٹریٹ'' یکم جون 1977ء)

اسی طرح کا ایک بیان وزیر داخلہ چرن سنگھ نے 9 جون 1977ء کو کانپور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے دیا۔ انہوں نے کہا کہ!

''اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان نہیں بنایا جاسکتا، جیسا کہ ہندی کو غیر ہندی ریاستوں میں بنایا جارہا ہے''۔

(''مورچہ''، گیا، 9 جولائی 1977ء، بحوالہ ''قومی آواز'' دہلی، 10 جون 1977ء)

اس تناظر میں انجمن ترقی اردو بہار اور اس کے قائد پروفیسر عبدالمغنی کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں کہ قومی سطح پر سیاسی منظر نامہ اردو کے خلاف تھا؛ لیکن کانگریس نے چوں کہ اپنے انتخابی منشور میں اردو کو اس کا حق دینے کا وعدہ کیا تھا؛ اس لیے کانگریس قیادت پر اردو والوں نے اپنا دباؤ برقرار رکھا۔ اس دوران اپریل 1977ء میں جاتے جاتے ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے انجمن کو سالانہ پچاس ہزار روپئے کا گرانٹ جاری کردیا۔ انجمن کے لیے سرکاری گرانٹ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آج انجمن کو حکومت سے سالانہ آٹھ لاکھ روپے ملتے ہیں۔ جون 1980ء میں جب ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا دوبارہ برسر اقتدار آئے تو انجمن ترقی اردو، بہار نے انہیں اردو کے سلسلے میں کانگریس کے وعدے یاد دلائے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت میں انجمن کے وفد نے ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا سے ملاقات کی، ان پر دباؤ ڈالا گیا۔ آخر کار تحریک رنگ لائی اور جگن ناتھ مشرا کی حکومت نے 19 جنوری 1981ء کو بہار آفیشیل لینگویج ایکٹ (بہار راج بھاشا قانون) میں ترمیم کر کے دستور کی دفعہ 345 کی رو سے اردو کو بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا اور 17 اپریل 1981ء کو پہلے مرحلے میں متحدہ بہار کے 15 اضلاع میں اردو کو باضابطہ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ پندرہ اضلاع تھے: پورنیہ، کٹیہار، دربھنگہ، سیتا مڑھی، بھاگلپور، مدھوبنی، بیگوسرائے، مظفر پور، سہرسہ، گیا، مشرقی چمپارن، نوادہ، مغربی چمپارن، دھنباد، سمستی پور؛ لیکن اس سلسلے میں جو نوٹی فکیشن جاری کیا گیا، اُس میں دانستہ، یا نادانستہ طور پر دو خامیاں رہ گئیں: پہلی یہ کہ بہار راج بھاشا قانون میں ترمیم کر کے

جب اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو اس میں اردو کے رسم خط کا کوئی ذکر نہیں ہے، جب کہ ہندی جب قومی زبان بنائی گئی تو اُس میں اُس کے دیوناگری رسم خط کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری خامی یہ ہے کہ اردو کو جن سات مقاصد کے لیے دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا، اُن میں اردو تعلیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان دو بڑی خامیوں کی طرف اردو والوں خاص طور پر الحاج غلام سرور کی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے حکومت کی توجہ مبذول کرائی؛ لیکن اس میں آج تک اصلاح نہیں ہوسکی۔ اردو والوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی زبان کے لیے اُس کے رسم خط کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی سے زبان کی شناخت ہے؛ اس لیے قانون اردو میں اردو کے رسم خط کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ اسی طرح کسی زبان کے فروغ کے لیے اُس کی تعلیم بھی ضروری ہے؛ اسی لیے جب اردو والوں نے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا مطالبہ کیا تھا تو اُس میں اردو والوں کا پہلا مطالبہ یہی تھا کہ ابتدائی سے یونیورسٹی کی سطح تک اردو تعلیم کو لازمی بنایا جائے؛ لیکن سرکاری نوٹی فکیشن میں اردو تعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس میں بھی آج تک اصلاح نہیں ہوسکی۔ 17 اپریل 1981ء کو اردو کو پندرہ اضلاع میں دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا پہلا نوٹی فکیشن (نمبر:652) جاری کیا گیا۔ اس میں اردو تعلیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نوٹی فکیشن کے سات نکات ملاحظہ کیجئے:

اردو میں عرضیوں اور درخواستوں کی وصولی اور اردو میں اس کا جواب دیا جانا

اردو میں تحریر شدہ دستاویزات کو رجسٹری آفس کے ذریعہ منظور کیا جانا

سرکاری قوانین، ضابطوں اور نوٹی فکیشن کی اردو میں بھی اشاعت

عوامی اہمیت کے حامل سرکاری حکم ناموں اور سرکلروں کا اردو میں جاری کیا جانا

سرکاری اشتہارات کی اردو میں بھی اشاعت

ضلع گزٹ کے اردو ترجمہ کی بھی اشاعت

سائن بورڈوں کی اردو میں بھی آویزاں کیا جانا

اس پہلے نوٹی فکیشن کے بعد حکومت خاموش ہوگئی؛ لیکن بہار میں اردو کے حقوق کے لیے پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت والی اور انجمن ترقی اردو، ہند سے الحاق شدہ ''انجمن ترقی اردو بہار'' اور الحاج غلام سرور کی سربراہی والی ''بہار ریاستی انجمن ترقی اردو'' کی جدوجہد جاری رہی۔ ان میں اوّل الذکر انجمن حکومت سے قریب تھی، جب تقریباً آٹھ برسوں تک ریاست کے دوسرے اضلاع میں

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے حکومت نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو پروفیسر عبدالمغنی اور ان کی انجمن نے سخت موقف اختیار کیا۔ اس دوران اگست 1983ء میں جگن ناتھ مشرا کی حکومت چلی گئی، اس کے بعد چندر شیکھر سنگھ (85-1983ء)، بندیشوری دوبے (88-1985ء) بھاگوت جھا آزاد (89-1988ء)، ستندر نارائن سنہا (مارچ 1989ء سے دسمبر 1989ء) بہار کے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔ تقریباً آٹھ برسوں تک حکومت کی طرف سے جب بالکل خاموشی رہی اور متحدہ بہار کے باقی اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے سلسلے میں جب کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تو انجمن ترقی اردو بہار نے حکومت پر زبردست دباؤ بنایا، میں اس سے قبل یہ عرض کر چکا ہوں کہ 8 جون 1989ء کو بہار شریف میں انجمن ترقی اردو بہار کی آل بہار اردو کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ ستندر نارائن سنہا کی موجودگی میں پروفیسر عبدالمغنی نے بے باکی کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ اگر اردو بولنے والوں کے مسائل حل نہیں کیے گئے تو وہ انتخاب کے موقع پر اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے کانگریس کو ووٹ نہیں دیں گے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی تقریر کا اثر ہوا اور انہوں نے اردو والوں کو باقی اضلاع میں بھی اردو کو نافذ کرنے کا یقین دلایا اور 29 جون 1989ء کو گیارہ اضلاع (اورنگ آباد، پٹنہ، بہار شریف، گوڈا، دیوگھر، صاحب گنج، گریڈیہہ، مونگیر، کھگڑیا، لوہردگا اور ویشالی) اور 16 اگست 1989ء کو 13 اضلاع (سیوان، ہزاری باغ، گملا، پلاموں، روہتاس، دُمکا، گوپال گنج، رانچی، سنگھ بھوم، سارن، بھوجپور، جہان آباد اور مدھے پورہ) میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا نوٹی فکیشن جاری کر دیا۔ اس طرح انجمن کی تحریک اور اس کی کوششوں سے پورے متحدہ بہار میں اردو کو سرکاری مراعات حاصل ہوگئیں۔ اس کے بعد ان تمام اضلاع میں بڑے پیمانے پر مترجم، نائب مترجم اور ٹائپسٹ کا تقرر ہوا اور آزادی کے بعد پہلی مرتبہ اردو براہ راست روزی روٹی سے جڑ گئی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انجمن ترقی اردو کی تحریک کے نتیجے میں ہی پٹنہ میں ایوب اردو گرلس ہائی اسکول اور پھلواری شریف میں ملت اردو گرلس ہائی اسکول کے علاوہ رانچی، گیا، جمشید پور اور کئی دوسرے شہروں میں اقلیتی اردو مڈل اور ہائی اسکول کھولے گئے، جن میں آج ہزاروں بچے اور بچیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور ان میں بڑے پیمانے پر تدریسی اور غیر تدریسی ملازمین کام کر رہے ہیں۔

اسی دوران ''اردو بھون'' سرکاری خرچ سے بنا اور پروفیسر عبدالمغنی کی انجمن ترقی اردو بہار کا

دفتر کرائے کی عمارت (لیڈی امام ہاؤس، پتھر کی مسجد پٹنہ-6) سے اُٹھ کر ''اردو بھون'' میں چلا آیا۔ اس طرح انجمن کو ایک مستقل آشیانہ بھی مل گیا اور اس کی سرگرمی آگے بڑھتی رہی، جب کہ غلام سرور کی ''بہار ریاستی انجمن ترقی اردو'' کی سرگرمیاں سمٹتے سمٹتے بالکل سمٹ گئیں؛ لیکن دو قائدین کی دوریاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ 1975ء کے بعد پروفیسر عبدالمغنی اور الحاج غلام سرور ایک عرصہ تک اردو کے پلیٹ فارم پر ایک ساتھ نظر نہیں آئے اور اخبار ''سنگم'' پروفیسر عبدالمغنی کا کٹر مخالف ہو گیا، پھر حالات نے کروٹ لی اور ایک ایسا وقت بھی آیا، جب دونوں نے ''اردو بھون'' میں ایک تقریب کے دوران اپنے گلے شکوے دور کیے اور غلام سرور نے پھر سے اردو والوں کی موجودگی میں اردو کی شمع پروفیسر عبدالمغنی کے حوالے کرنے کا اعلان کیا۔ اُس وقت غلام سرور، لالو پرساد کی حکومت میں وزیر زراعت تھے اور کافی دنوں سے بیمار تھے۔ یہ تقریب حالاں کہ ''یوم اردو اور رسم اجرا'' کے موقع پر منعقد کی گئی تھی؛ لیکن دراصل یہ ''ملن تقریب'' تھی۔ اس کی روداد ''حلقۂ ادب بہار'' کے ترجمان ''مریخ'' میں تفصیل سے شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ کیجیے رپورٹ:

''گذشتہ 10 جنوری 2001ء کو مقامی اردو بھون میں پروفیسر عبدالمغنی، صدر انجمن ترقی اردو بہار (سابق وائس چانسلر، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) نے چار کتابوں کا اجرا ایک جلسہ میں کیا۔ اِن میں دو ''مضامین غلام سرور'' اور ''خطبات غلام سرور'' ہیں اور ایک جناب طلبی کی تاثراتی کتاب الحاج غلام سرور (وزیر زراعت حکومت بہار) کے متعلق، جب کہ دوسری کتاب ان سپاس ناموں کا مجموعہ ہے، جو جناب غلام سرور کے دورِ وزارت میں اُن کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ... یہ عظیم آباد؛ بلکہ بہار کی ایک یادگار تاریخی شام تھی، جس میں اردو تحریک کے دونوں مشہور قائدین جمع تھے اور نہ صرف وسیع ہال؛ بلکہ اس کے باہر بھی اردو دوستوں کا ایک بڑا مجمع گوش برآواز تھا، اس میں بزرگ دانشور بھی تھے اور متعدد نوجوان بھی۔ سب سے پہلے مشہور شاعر مختار احمد عاصی نے ایک نظم نہایت مترنم آواز میں پڑھی، جس میں الحاج غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بہار کی آبادی کی خوش قسمتی سے آج ایک طویل مدت کے بعد اردو تحریک کے دو آفتاب ایک افق پر جمع ہیں۔ ایک سماں بندھ گیا اور سامعین سرشار ہوئے۔ اس پُر جوش ماحول میں الحاج غلام سرور نے اپنی مختصر

تقریر میں جو ان کے دلی جذبات سے لبریز تھی کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی خدا کی ایک نعمت ہیں۔ ہم دونوں مدت تک اردو تحریک کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، گرچہ پچھلے کچھ برسوں میں ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہو گئے اور ہم اپنے اپنے طریقے سے کام کرتے رہے۔ اردو تحریک بہار میں ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک ہے، اب میری عمر کافی ہو چکی ہے اور کہنا مشکل ہے کہ کب تک آپ کے درمیان رہوں گا، لہٰذا اب اردو تحریک کی مشعل میں پروفیسر عبدالمغنی کے حوالے کرتا ہوں، جو اُن کے ہاتھوں میں محفوظ ہے اور آئندہ تحریک کی قیادت وہی کریں گے۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالمغنی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج جو جذبات تمام حاضرین و سامعین پر طاری ہیں، وہ مجھ پر بھی طاری ہیں.... ہماری محبت سچی ہے، جس طرح ایک شمع کے گرد مختلف پروانے طواف کرتے ہیں، اُسی طرح ہم اردو کے عاشق اس کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں، ہمارے درمیان کوئی رقابت نہیں، میرے برادر محترم الحاج جناب غلام سرور نے تحریک اردو کی قیادت کی جو روشن مشعل میرے حوالے کی ہے، میں اسے ان شاء اللہ آئندہ نسلوں کے حوالے کروں گا، گرچہ میرے کمزور کاندھوں پر یہ بوجھ بہت بڑھ گیا ہے اور میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے؛ مگر میں جس طرح اب تک کام کرتا رہا ہوں، ان شاء اللہ آئندہ بھی جب تک ممکن ہے کرتا رہوں گا....''۔

(''مریخ''، جنوری۔ فروری 2001، صفحہ۔ 38-37)

اس تاریخی واقعہ کے گواہ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر مشتاق احمد، ہارون رشید، فخر الدین عارفی، ڈاکٹر اسلم جاوداں، انوار الحسن وسطوی اور کئی دوسرے محبان اردو ہیں۔ غلام سرور بیمار تھے، پیشاب کی تکلیف تھی، کیتھیٹر لگا ہوا تھا۔ وہ اسی حالت میں تقریب میں شریک ہوئے تھے، عجیب و غریب منظر تھا، 1975ء میں بچھڑے ہوئے دو بزرگ رفیق (غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی) 26 برسوں کے بعد 2001ء میں دوبارہ گلے مل رہے تھے؛ لیکن اس پُرمسرت ماحول میں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ پانچ برسوں کے اندر اس انجمن کو ایک مرتبہ پھر گہن لگ جائے گا اور سالارِ اعظم کی موجودگی میں ہی انجمن بے وقار ہو جائے گی اور اس کا درد لیے پروفیسر عبدالمغنی ہمیشہ کے لیے دنیا سے چلے جائیں گے۔

1975ء میں مظفر پور میں ''انجمن ترقی اردو'' کے دو حصے ہوئے اور 31 برسوں کے بعد

2006 میں اِسے چھپرہ میں پروفیسر عبدالمغنی کی موجودگی میں دوسرا بڑا جھٹکا لگا، یہ جھٹکا اتنا زبردست تھا کہ انجمن بے جان ہوکر رہ گئی، جو انجمن سے تعلق رکھتے ہیں اور جو اس کے دستورالعمل سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کے عہدیداروں یعنی صدر اور سکریٹری کا انتخاب ہوتا ہے، اس کے لیے کانسلروں کا اجلاس ہوتا ہے اور کانسلر ہی دونوں عہدیداروں کو منتخب کرتے ہیں۔ 1975ء سے لے کر اپنی حیات تک؛ یعنی 31 برسوں تک پروفیسر عبدالمغنی انجمن کے لگاتار صدر رہے؛ یعنی تین دہائیوں تک انہوں نے انجمن ترقی اردو کی سربراہی کی اور پورے اخلاص کے ساتھ اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت کرتے رہے؛ لیکن آخر وقت میں اُنہیں اپنے ہی لوگوں سے شدید نقصان پہنچا اور تحریک بے جان ہوکر رہ گئی؛ یعنی انجمن ترقی اردو کو ایک جھٹکا مظفر پور میں اور دوسرا جھٹکا چھپرہ میں لگا۔ مظفر پور کی روداد اوپر گذر چکی ہے، چھپرہ کی روداد بھی کافی دلچسپ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ 19 اکتوبر 2003ء کو وہاں کے ''ایکتا بھون'' میں آل بہار اردو کنونشن انجمن کے صدر پروفیسر عبدالمغنی کی صدارت میں ہوا، اس کنونشن میں صدر، سکریٹری اور مجلس عاملہ کے عہدیداروں کا انتخاب ہونا تھا۔ اس اجلاس میں حسب سابق پروفیسر عبدالمغنی اتفاق رائے سے صدر منتخب کر لیے گئے، اس کے بعد سکریٹری کے انتخاب کا معاملہ آیا، اس عہدے کے لیے عبدالقیوم انصاری (چھپرہ) کے نام کی تجویز پیش ہوئی، اس عہدے کے لیے دوسرا نام فخرالدین عارفی کا آیا، اس کے بعد دونوں اُمیدواروں میں بحث وتکرار شروع ہوگئی۔ اس واقعہ کے کئی عینی مشاہدین ہیں، جن میں تمنا مظفر پوری بھی شامل تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''.... عبدالقیوم صاحب نے فخرالدین صاحب سے کہا کہ پٹنہ میں آپ نے کہا تھا کہ اگر میں (انصاری صاحب) سکریٹری شپ کے اُمیدوار ہوں گے تو آپ (عارفی صاحب) ان کی مخالفت نہیں کریں گے، پھر آپ نے نام کیوں پیش کروایا؟ دونوں حضرات میں بحث ہونے لگی۔ اس بیچ تیسرا نام سید احمد قادری کا پیش ہوا، یہ بات تو طے شدہ تھی کہ جب چھپرے میں کنونشن ہو رہا ہے تو ایک کلیدی عہدہ وہاں جانا ہے..... بحث میں گرماگرمی آئی تو لوگوں نے عبدالمغنی صاحب پر فیصلہ چھوڑ دیا کہ وہ جسے کہہ دیں گے، وہ سکریٹری ہوگا۔ اس درمیان ایک اور نام سید احمد قادری پیش کرنے جا رہے تھے کہ عبدالمغنی صاحب نے اُنہیں ڈانٹ کر بیٹھا دیا اور خود مائک پر آ گئے۔

لوگوں نے سمجھا کہ عبدالمغنی صاحب سکریٹری کے نام کا فیصلہ سنائیں گے؛ لیکن وہ تجاویز پڑھ کر سنانے لگے.... پورا ہال حیران تھا کہ ابھی سکریٹری کے نام کا فیصلہ ہوا نہیں اور ریٹرننگ افسر نے صدر اور سکریٹری کے انتخاب کا اعلان کیا نہیں ہے، پھر یہ تقریر کیسی؟ ریٹرننگ افسر (ڈاکٹر اسری ارشد) چپ چاپ بیٹھے رہے۔ عبدالمغنی صاحب کی تقریر اور تجاویز کے بعد ڈیلی گیٹس کی طرف سے شور ہوا کہ سکریٹری کون ہوئے یہ تو اعلان کیا جائے۔ ریٹرننگ افسر کے اعلان کے پہلے تجاویز کیسے منظور ہوگی، ابھی شور ہو ہی رہا تھا کہ جناب عارفی صاحب اُٹھے اور مائیک پر آ کر اپنا نام سکریٹری شپ کے اُمیدوار کی حیثیت سے واپس لے لیا، وہ عبدالمغنی صاحب پر برہم تھے، غصے میں بیٹھ گئے''۔

تمنا مظفر پوری (مرحوم) آگے لکھتے ہیں:

''چوں کہ میں عبدالقیوم صاحب کو نہیں جانتا تھا اور نہ اُن کے کسی کام کا مجھے علم تھا، میں خاموش تماشائی بنا رہا، جب موقع ملا تو میں نے سید احمد قادری صاحب سے پوچھا کہ یہ عبدالقیوم صاحب کون ہیں؟ ان کا کیا کارنامہ ہے۔ میرے سوال کا جواب بجائے قادری صاحب کے عارفی صاحب نے یوں دیا۔ 'ایک معمولی ٹیچر ہے، اسے کوئی نہیں جانتا'۔ پھر فخرالدین صاحب احتجاجاً وہاں سے چل دیے اور پٹنہ کے لیے بس پکڑ لیا، چوں کہ مجھے بھی پٹنہ آنا ضروری تھا۔ میں بھی بس اسٹینڈ آ گیا اور اسی بس میں سوار ہو گیا، جس میں عارفی صاحب اور دیگر ڈیلی گیٹ سوار تھے۔ بس میں بھی عارفی صاحب برہم نظر آئے، وہ عبدالمغنی صاحب سے اس قدر بدظن تھے اور ان کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے، جیسے کسی گلی کی 'بدزن' آپس میں جھگڑتی ہیں اور بدزبانی کرتی ہیں''۔

(تمنا مظفر پوری کی یہ تحریر میرے پاس محفوظ ہے)

چھپرہ کے کنونشن میں حاجی پور سے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، انوارالحسن وسطوی، سید مصباح الدین احمد اور ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق بھی شریک ہوئے۔ اس واقعہ کی تصدیق مجاہد اردو انوارالحسن وسطوی نے بھی کی۔ انہوں نے کہا کہ:

''جب فخرالدین عارفی نے اپنا نام واپس لینے کا اعلان کیا تو سید احمد قادری نے کہا کہ آپ کا نام ہم لوگوں نے پیش کیا ہے تو آپ کیوں واپس لے رہے ہیں؟ جب

فخرالدین عارفی نام واپس لینے کے اپنے فیصلے پر قائم رہے تو سکریٹری کے عہدے کے لیے صرف ایک نام عبدالقیوم انصاری کا رہ گیا۔ اس نازک حالت میں بھی پروفیسر عبدالمغنی کی ایمانداری اور انصاف پسندی کی جھلک یہاں نمایاں طور پر نظر آئی، جب عارفی صاحب کے اس فیصلے کے بعد عبدالقیوم انصاری کے بلا مقابلہ منتخب ہونے کا راستہ ہموار ہوگیا تو پروفیسر عبدالمغنی نے اُنہیں (عبدالقیوم انصاری کو) سکریٹری منتخب کر لیے جانے کا اعلان کر دیا، اگر پروفیسر عبدالمغنی صاحب ایسا نہیں کرتے تو یہ غلط ہوتا؛ کیوں کہ فخرالدین عارفی کے نام واپس لینے کے بعد میدان میں سکریٹری کے عہدے کے لیے کوئی دوسرا امیدوار نہیں تھا‘‘۔

اس طرح مظفر پور سے انجمن کا جو قافلہ غلام سرور کو چھوڑ کر آگے بڑھا، وہ چھپرہ میں آ کر بدترین انتشار کا شکار ہوگیا اور انجمن میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی، جس سے پروفیسر عبدالمغنی بہت بددل ہوگئے، جس کا اظہار انہوں نے اپنے آخری انٹرویو میں (جو اُن کے انتقال سے صرف پندرہ دن پہلے لیا گیا تھا) کیا ہے۔ اس انٹرویو کو اس کتاب کے آخر میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اس مرتبہ عہدہ اور سرکاری گرانٹ انجمن میں انتشار کا سبب بنا۔ پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت والی انجمن نے چھپرہ میں اپنے منتخب سکریٹری عبدالقیوم انصاری پر انجمن کے 8 لاکھ روپے خرد برد کرنے کا الزام لگا کر اُنہیں سکریٹری کے عہدے سے پہلے معطل اور پھر برطرف کر دیا۔ اس وقت ہارون رشید صاحب انجمن کے کارگذار صدر تھے۔ اُنہیں بھی عبدالقیوم انصاری کا ساتھ دینے کے پاداش میں عہدے سے برطرف کر دیا گیا، پھر کیا تھا دونوں برطرف عہدیداروں کی ٹولی پروفیسر عبدالمغنی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک الگ محاذ کھڑا ہوگیا۔ ہارون رشید متوازی انجمن کے صدر بن گئے اور عبدالقیوم انصاری سکریٹری کے عہدے پر برقرار رہے۔ ان دونوں نے اپنی انجمن کو اصل انجمن قرار دے دیا اور مختلف اضلاع اور کمیشنریوں میں انجمن کی الگ شاخیں قائم کرلیں، یعنی انجمن کی تاریخ نے پھر کروٹ لی اور ’’انجمن ترقی اردو بہار‘‘ کے نام سے دو متوازی انجمن کام کرنے لگی۔ ایک انجمن کے صدر پروفیسر عبدالمغنی اور اسی نام سے دوسری انجمن کے صدر الحاج ہارون رشید ہوگئے۔ عبدالقیوم انصاری تو پہلے سے منتخب سکریٹری تھے ہی۔ پروفیسر عبدالمغنی کو اس بات کا فخر حاصل تھا کہ غلام سرور وزیر ہوکر بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دلا سکے؛ لیکن اُن کی قیادت میں بہار میں اردو کو سرکاری مراعات حاصل

ہوگئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی کی تمام تر قربانیوں اور خدمات کے باوجود ان کی زندگی میں ہی انجمن ان معنوں میں اُن کے ہاتھ سے نکل گئی کہ ان کی موجودگی میں متوازی انجمن کام کرتی رہی۔ اردو بھون میں انجمن کے دفتر پر اُس کا ہی قبضہ رہا اور سرکاری گرانٹ بھی اُسے ہی ملتا رہا۔ تقریباً ڈھائی تین برسوں تک انجمن کا تنازعہ چلتا رہا، جو پروفیسر عبدالمغنی کی حیات تک حل نہیں ہوا، اس جھگڑے کی وجہ سے وہ کافی پریشان بھی رہے، جس کا اظہار انہوں نے اپنے آخری انٹرویو میں تفصیل سے کیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ’’انجمن ترقی اردو بہار‘‘ اپنے نام سے تو زندہ ہے، اردو بھون میں اُسے بہترین آشیانہ بھی ملا ہوا ہے، اُسے سرکاری گرانٹ (8 لاکھ روپے سالانہ) بھی مل رہا ہے؛ لیکن آج اردو والے اُس انجمن کو تلاش کررہے ہیں، جس کا کوئی باضابطہ آشیانہ نہیں تھا، اسے سرکاری گرانٹ بھی نہیں ملتا تھا، جس کے قائد الحاج غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی تھے۔

اردو تنقید اور پروفیسر عبدالمغنی

اردو میں ''تنقید نگاری'' باضابطہ صنف بن چکی ہے۔ ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' (حصہ اوّل ادبیات) میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

> ''اردو میں ادبی اصطلاح کے طور پر یہ لفظ دو معنی میں مستعمل ہے: (۱) کسی ادب پارے کی خوبی، یا خرابی بیان کرنا (۲) تنقید کے اصول قائم کرنا، اصناف ادب کی تعریف اور پہچان سے بحث کرنا، تنقیدی تحریروں کی خوبی، یا خرابی بیان کرنا، فلسفہ اور دوسرے علوم کے حوالے سے نقد ادب کی جہتیں تلاش کرنا اور تنقید کی تاریخ سے بحث کرنا''۔ (صفحہ۔178)

اس پس منظر میں اردو میں تنقید نگاری پروان چڑھی اور پروفیسر عبدالمغنی کی پیدائش (1936ء) تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی ارتقائی سفر طے کیے۔ اس دوران فن پاروں کو پرکھنے کے کئی پیمانے بنے۔ اردو میں تنقید کی بنیاد 1844ء میں اُس وقت پڑی، جب امام بخش صہبائی نے میر شمس الدین فقیر کی ''حدائق البلاغت'' کا ترجمہ کیا۔ اصل کتاب میں مثالیں فارسی اور عربی سے تھیں، صہبائی نے مثالیں اردو سے اخذ کیں اور خود فقیر کی اصل عبارت کے ترجمے میں خاصی آزادی سے کام لیا، اس طرح ان کا ترجمہ ایک تقریباً آزاد تصنیف کا حکم رکھتا ہے اور اسے اردو کی پہلی تنقیدی کتاب کہا جاسکتا ہے۔

(بحوالہ اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد اوّل، ادبیات)

اس طرح میر شمس الدین فقیر کے تنقیدی سفر میں وجہی نے ''قطب مشتری'' (1609ء)، ابن نشاطی نے ''پھول بن'' (1655ء)، نصرتی بیجاپوری نے مثنوی ''علی نامہ'' (1665ء)، محمد حسین آزاد نے

''آب حیات'' (1880ء)، الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' (1893ء) اور ''یادگار غالب'' 1897ء) کو شامل کیا۔ الطاف حسین حالی کی آخری الذکر دو کتابیں جدید تنقید کی بنیاد ہیں۔ ان میں ''مقدمہ شعروشاعری'' کا شمار اصول تنقید کی آج بھی معتبر تصنیف میں ہوتا ہے، پھر علامہ شبلی نعمانی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' (1907ء) اور پانچ جلدوں میں ''شعرالعجم'' (1914-1909ء) لکھ کر اردو میں عملی اور تقابلی تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد اردو تنقید ترقی پسند تحریک کے زیر اثر آ گئی، جس وقت پروفیسر عبدالمغنی پیدا ہوئے، (یعنی 1936ء میں) ترقی پسند تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ اس تحریک سے متاثر ہونے والوں میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سفر میں جب پروفیسر کلیم الدین احمد شامل ہوئے تو انہوں نے اردو شعروادب کو مغرب کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی؛ لیکن پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی راہ الگ بنائی، وہ چوں کہ انگریزی ادب کے استاذ تھے؛ اس لیے اُن کے تنقیدی شعور کو بالیدہ کرنے میں انگریزی ادب کا بھی عمل دخل رہا؛ لیکن اُن کا اسلامی شعور ہمیشہ بیدار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نگارشات اسلامی اور اخلاقی قدروں سے خالی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''نقطۂ نظر'' اور ''معیار و اقدار'' میں ہی اپنا تنقیدی نقطۂ نظر واضح کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

> (۱) ''میری ادبی تنقیدوں کا بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔ میرے خیال میں انسان کی زندگی کسی حیوانی ارتقاء کا نمونہ نہیں، یہ ایک الوہی تنقید کا نتیجہ ہے، چناں چہ آدمی طبعاً ایک ذمہ دار اور شریف مخلوق ہے۔ انسانی سماج کی ترقی جنسی، یا معاشی کش مکش کی مرہون منت نہیں، یہ ترقی سراسر اخلاقی تعاون کا عطیہ ہے''۔

(''نقطۂ نظر''، صفحہ۔20)

> (۲) ''میرا نظریہ تنقید فکری طور پر دینی اور عملی طور پر اخلاقی ہے.... ادب کی حقیقت تو یقیناً اصناف ادب کی متعلقہ ہیئتوں کے لوازم وعناصر ہی کے پیش نظر متعین کی جائے گی؛ لیکن ادب کی عظمت لازماً کسی اخلاقی معیار سے دریافت کی جائے گی اور اس معیار کی تشکیل ایک دینی نقطۂ نظر سے ہی ہوگی؛ اس لیے کہ دین ہی بہ یک وقت اخلاقیات و جمالیات دونوں کا بہترین اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ تصور پیش کرتا ہے....''۔

(''معیار و اقدار''، سنہ اشاعت 1981ء)

پروفیسر عبدالمغنی نے اپنا جو نظریہ تنقید بنایا تھا، اس کا ہی اثر تھا کہ جب کلیم الدین احمد نے کہا کہ

''اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے''، تو فوراً پروفیسر عبدالمغنی نے اس کا جواب دیا کہ ''عالمی ادب میں اقبال کا ممتاز ترین مقام ہے''۔ اسی طرح جب کلیم الدین احمد نے یہ کہا کہ ''غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے''، تو پروفیسر عبدالمغنی نے اس کے جواب میں ایک مکمل مضمون لکھ ڈالا۔ یہ مضمون ''غزل..... مہذب ترین صنف سخن شاعری'' کے عنوان سے اُن کی کتاب ''معیار واقدار'' میں شامل ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے تنقید کے تعلق سے اپنا جو نظریہ بنایا تھا، اُس پر وہ آخر وقت تک قائم رہے اور اُن کی فکر سے جو بھی نظریے ٹکرائے، ان کو انہوں نے یکسر مسترد کر دیا اور اپنے نظریہ سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علامہ اقبال کو غزل گوئی کی قدیم روایت میں انقلاب برپا کرنے والا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون ''مجروح کی غزل گوئی'' میں پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں کہ:

> ''.... انہوں نے (اقبال) جدید نظم نگاری کے ساتھ ساتھ غزل گوئی کی قدیم روایت میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ اس کے بعد اردو غزل وہ رہی ہی نہیں، جو غالب اور ان کے کم عمر معاصرین تک رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ تخیل اور موضوع کے لحاظ سے اقبال کے بے مثال تغزل نے ایک بالکل نیا نظام قائم کیا؛ بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی تازہ استعارات کے علاوہ فرسودہ استعارات میں تازہ مفاہیم پیدا کر دیے....''۔

(''مریخ''، جون۔اگست 2000ء، صفحہ۔5)

پروفیسر عبدالمغنی حالاں کہ اپنے تنقیدی نظریے اور اپنی خاص اسلامی فکر کے مبلغ نہیں تھے؛ لیکن اُن کی کوشش یہی تھی کہ اردو شعر و ادب اپنی خوشبو سے جانا پہچانا جائے، وہ اپنے اوپر ''مغربیت'' طاری نہ کرے۔ ان کی ابتدائی تحریریں ہوں، یا بعد کی تحریریں اُن سب میں تعمیر پسندانہ تصورات اور اعتدال پسندی نمایاں نظر آتی ہے۔ اُن کے تنقیدی مقالات کے مجموعہ ''نقطۂ نظر'' (1965ء)، ''جادۂ اعتدال'' (1972ء)، ''تشکیل جدید'' (1976ء)، ''معیار واقدار'' (1981ء)، ''تنقید مشرق'' (1987ء)، ''تصورات'' (1988ء)، ''اسلوب تنقید'' (1989ء)، ''تنقیدی زاویے'' (1993ء) اور ''فروغ تنقید'' (1998ء) میں مجموعی طور پر 150 مضامین ہیں۔ ان کے علاوہ ''مریخ'' سے لے کر ملک اور بیرون ملک سے نکلنے والے مختلف رسائل واخبارات میں مختلف عنوان سے شائع ہونے والے ان کے کئی ادبی اور تنقیدی مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ ان تمام مضامین میں پروفیسر عبدالمغنی کے تصورات اور نظریات بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی خاص فکر اُنہیں اپنے ہم عصر تنقید نگاروں سے ممتاز و ممیّز کرتی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کے اداریے۔ایک جائزہ

پروفیسر عبدالمغنی 1974ء سے انجمن ترقی بہار کے تاحیات صدر رہے۔ ''حلقۂ ادب بہار'' انجمن کا ایک ادبی ادارہ تھا، جس کا ترجمان ''مریخ'' ہوا کرتا تھا۔ یہ رسالہ پروفیسر عبدالمغنی کی زندگی میں ہی بند ہو گیا۔ پروفیسر عبدالمغنی اس کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ جب تک نکلتا رہا، وہ اس کے مدیر رہے۔ اس کے ہر شمارے میں ''سطور اوّلیں'' کے تحت پروفیسر عبدالمغنی کا اداریہ ہوا کرتا تھا، جس میں زیادہ تر ادبی اور لسانی موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ اس کے بعد عام طور پر پہلا مضمون بھی پروفیسر عبدالمغنی کا ہی ہوا کرتا تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اس رسالے کو معنویت عطا کی، معیار بخشا اور اس کے وقار میں اضافہ کیا۔ یہ بہار سے نکلنے والا کسی ادبی ادارے کا غالباً ایسا پہلا رسالہ تھا، جسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ پروفیسر عبدالمغنی کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ رسالہ بہار میں اردو تحریک کا بھی ترجمان تھا۔ اس نے اردو تحریک کو فروغ دینے اور اسے مضبوط بنانے میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں، اردو ہمارے لیے اہمیت کی حامل کیوں ہے اور اردو رسم خط کی ضرورت کیوں ہے؟ ان تمام امور پر پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے مختلف اداریے میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان تمام اداریوں سے اردو کے فروغ کے راستے ہموار ہوئے۔ اپنے ایک اداریہ میں پروفیسر عبدالمغنی نے ''اردو کی ترقی کے لیے ٹھوس اقدامات'' کے عنوان سے لکھا کہ:

''اردو کی سرکاری حیثیت کا قانون بھی اردو کے مسئلے کا قطعی حل نہیں ہے، جب تک اس کا پورا نفاذ حکومت کے تمام محکموں اور دفتروں میں، شمالی ہند میں ہندی کی طرح نہ ہو جائے اور اردو اپنے ہمہ جہتی استعمال کے اعتبار سے قومی نظام عمل کا جز نہ بن جائے۔ یہاں سوال قومی یکجہتی کا اُٹھتا ہے، جس کے لیے 1949ء میں سہ لسانی فارمولا وضع کیا گیا تھا؛ لیکن اس پر عمل کے بجائے سرکاری طور پر اس کو مسخ کرنے کی کوشش آدھی صدی سے مسلسل ہو رہی ہے''۔

(''مریخ''، صفحہ۔3، شمارہ جون۔اگست 2000ء)

اسی اداریہ میں انہوں نے اردو والوں کو اردو کی ترقی کے لیے درج ذیل ٹھوس اقدامات کرنے کا مشورہ دیا:

(۱) ''اردو ذریعہ تعلیم کے لیے پرائمری اسکولوں کا قیام واستحکام وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کو پورا کرنے کے لیے نام نہاد اور پرفریب انگریزی میڈیم کے سراسر جاہلانہ اور احمقانہ طلسم سے نکلنا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ مشنری اسکول بھی اپنی ظاہری شان وشوکت کے باوجود انگریزی نہیں سکھاتے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر یہاں کے تعلیم یافتہ آئندہ تعلیم، یا زندگی کے کسی دایرے میں آگے نہیں بڑھتے۔ مغرب زدہ لوگوں کے لیے شاید یہ انکشاف ہو۔ بہر حال دنیا بھر کے ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ پرائمری ایجوکیشن مادری زبان میں ہونا چاہیے؛ تا کہ بچے کا ذہن صحیح طور پر بن سکے؛ اس لیے کہ جو زبان گھر میں بولی جاتی ہے، وہی موثر ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے، جب کہ ایک مضمون کے طور پر کوئی دوسری زبان پڑھائی جاسکتی ہے اور ابھی ہندوستان میں کچھ دن اور انگریزی پڑھائی جانی چاہیے؛ اس لیے کہ اعلیٰ تعلیم میں اردو کے سرکاری قتل کے بعد کوئی دوسری زبان آزادی کے بعد بھی نصف صدی میں انگریزی کی جگہ نہیں لے سکی، حالاں کہ آزادی سے قبل مرحومہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے آرٹس اور سائنس سبھی کے لیے اعلیٰ تعلیم اردو میں ہی دلائی تھی اور وزیر اعلیٰ سے وزیراعظم تک آزادی کے دور میں بھی پیدا کیے''۔

(۲) ''معاشرتی اور تہذیبی تقریبات میں اردو دوست ذریعہ اظہار

کے طور پر اردو کا ہی استعمال کریں اور اس سلسلے میں کسی بھی سرکاری وغیر سرکاری دباؤ کے تحت کوئی سمجھوتہ نہ کریں، تقریبات کے دعوت نامے خصوصیت کے ساتھ اردو میں چھپوائے اور تقسیم کیے جائیں''۔

(۳) ''اردو دوست اپنے مکانوں دفتروں اور دکانوں کی تختیاں اردو میں ضرور لگوائیں''۔

(۴) ''جن ریاستوں مثلاً بہار، اتر پردیش اور دہلی میں اردو کی دوسری سرکاری حیثیت کا قانون ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ اسمبلی سے منظور ہو گیا ہے، وہاں اس کے مکمل وموثر نفاذ پر زور دیا جائے اور اس مقصد کے لیے ہر ممکن جمہوری وقانونی دباؤ ڈالا جائے، سب سے بڑھ کر اردو بولنے والے خود اردو کا سرکاری استعمال کریں اور متعلقہ محکموں سے کرائیں''۔

(''مریخ''، شمارہ جون۔اگست 2000ء، صفحہ۔4)

پروفیسر عبدالمغنی نے ''سہ لسانی فارمولا'' کو زبان کے مسئلہ کا حل قرار دیا اور اپنے ایک اداریہ میں تحریر کیا کہ:

''.... جب قومی یک جہتی اور اس طرح مسئلہ زبان کے حل کے لیے 1961ء کی وزرائے اعلیٰ کانفرنس میں سہ لسانی فارمولا ترتیب دیا گیا تو اس کو اختیار صرف اہلِ اردو نے کیا اور وہ دوسری زبان کے طور پر ہندی پڑھنے لگے، جب کہ ہندی والوں نے محض اردو کو نظر انداز کرنے کے لیے دوسری زبان کے طور پر سنسکرت اختیار کر لی اور اس کو قدیم کے بجائے جدید ہندوستانی زبان زبردستی قرار دے دیا''۔

انہوں نے اسی اداریہ میں آگے لکھا کہ:

سہ لسانی فارمولا ہی صحیح اور قابل عمل نیز معقول ومفید شکل ہے:

پہلی زبان	مادری زبان
دوسری زبان	جدید ہندوستانی زبان
تیسری زبان	انگریزی زبان

پروفیسر عبدالمغنی نے لکھا کہ:

''اس فارمولے کی اصلیت پر بحثیں ہو چکی ہیں اور اس میں بعض اوقات ناروا

تبدیلی کی کوشش بھی کی گئی ہے، جیسے لکھنؤ میں ایک بار کرپلانی کمیشن، یا کمیٹی نے دوسری زبان کو توڑ مروڑ کر کے اس میں سنسکرت کے لیے گنجائش نکال لی اور ہندی بولنے والے اسی پر عمل کر رہے ہیں''۔

انھوں نے سوال کیا کہ:

''قومی یکجہتی کی کون سی صورت ہے کہ دوسری زبان کے طور پر اردو والے تو ہندی اختیار کریں اور ہندی والے اردو کو نظر انداز کر کے سنسکرت لے لیں؟ یہ تو صریح فرقہ پرستی ہے اور اس کے نتائج خود ہندی کے لیے تباہ کن ہو رہے ہیں۔ ہندی، ہندوستانی کے بغیر جواب صرف اردو کو کہا جا سکتا ہے، کیسے پنپ سکتی ہے؟''

(''مریخ''، شمارہ جنوری۔مئی 2000ء، صفحہ۔4)

ایک موقع پر جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید ہاشم علی نے یہ کہہ دیا کہ اردو کے رسم خط میں تبدیلی تحفظ زبان کے لیے ضروری ہے تو پروفیسر عبدالمغنی نے ان کے اس بیان کا نوٹس لیا اور اپنے اداریہ ''رسم خط ہی زبان ہے'' کے عنوان سے لکھا کہ!

''آزاد ہندوستان میں اردو زبان اپنے رسم خط کے ساتھ چالیس (۴۰) سال سے زندہ اور تابندہ ہے اور تمام مشکلات اور تعصّبات کے باوجود اس کی رفتار ترقی رکی نہیں ہے، لہذا تحفظ کا وہ سوال تو سرے سے نہیں ہے، جس کا مفروضہ قائم کر کے وائس چانسلر صاحب نے نصیحت فرمائی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی بات بے وقت کی راگنی ہے''۔

(''مریخ''، صفحہ۔3، شمارہ اگست۔دسمبر 1986ء)

اسی اداریے میں انھوں نے آگے لکھا:

''واقعہ یہ ہے کہ عربی الاصل اور فارسی سے بھی متاثر ہونے کے باوجود اردو کا رسم خط اس کا اپنا فطری طریق تحریر ہے؛ اس لیے اس کے حروف تہجی عربی و فارسی حروف سے زائد ہیں، چناں چہ جو حروف تہجی اردو کے ہیں، وہ سب کے سب نہ عربی میں ہیں، نہ فارسی میں، پھر اردو ادب محض زبان نہیں ہے، اس کا ایک بہت ترقی یافتہ ادب بھی پیدا ہو گیا ہے، جس کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے اور اس میں علوم وفنون کا جو خزانہ ہے، وہ سب اردو رسم خط ہی میں ہے؛ اس لیے کہنا چاہیے کہ اب رسم خط ہی زبان ہے، وہ جسم

اردو کا فقط لباس نہیں، اس کی کھال ہے، جس کے ساتھ اردو زبان وادب کا جسم پروان چڑھا ہے، لہٰذا ہم دنیا کی کسی طاقت کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہماری زبان کی کھال ادھیڑ کر پلاسٹک سرجری سے کوئی مصنوعی کھال لگا دے۔ اس طرح تو ہماری زبان کا ارتقا اسی طرح رک جائے گا، جس طرح عصر حاضر میں ترکی زبان اور چینی زبان کے ساتھ لاطینی رسم خط اختیار کرنے سے ہوا ہے''۔(صفحہ۔4)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی مغرب کی نقالی میں اردو ادب میں کیے جانے والے نئے نئے تجربات کے بھی شدید مخالف تھے۔ انھوں نے اس کے خلاف بھی تحریک چھیڑ رکھی تھی۔ اسی تحریک کے تحت انھوں نے ''مریخ'' میں بھی کئی اداریے لکھے۔ اس کا تفصیل سے ذکر قبل کے صفحات میں ہو چکا۔ اس کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی نے ''مریخ'' کے اداریے میں ادب کے حوالے سے بھی مختلف موضوعات پر بڑی جامع گفتگو کی، جو اردو کے طالب علم اور اساتذہ دونوں کے لیے مفید ہے۔ انھوں نے ''ادبی تنقید'' کے عنوان سے اپنے ایک اداریہ میں ادبی تنقید کے مراحل اور اس کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے تنقید میں سنجیدگی اور وقار کو ضروری قرار دیتے ہوئے لکھا:

''تنقید کے عمل کے ساتھ ہی اس کے اسلوب کو بھی محکم و متین ہونا چاہیے۔ اس میں سنجیدگی اور وقار کا ہونا ضروری ہے؛ اس لیے کہ تنقید کوئی ہلکی پھلکی انشائیہ نگاری، یا معمولی قسم کی مزاحیہ نگاری، یا تفریحی افسانہ نگاری نہیں ہے۔ اس میں حقائق کی وضاحت کے لیے ایک واضح قسم کی فصیح و بلیغ انشاپردازی سے کام لیا جاتا ہے۔ ناقد مصلح ہو، یا نہیں ہو، ایک ادبی مفکر ضرور ہوتا ہے اور فکر کے ابلاغ کے لیے بامعنی، بامقصد، صاف و صریح، مربوط و منظّم اور پر اثر طرز تحریر مطلوب ہے''۔

(''مریخ''، ستمبر 1994ء، صفحہ۔3)

پروفیسر عبدالمغنی کی نگاہ صرف انگریزی ادب پر ہی گہری نہیں تھی؛ بلکہ اردو ادب کا بھی انھوں نے بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بہت ہی جامع انداز میں دونوں زبان کے اصناف ادب کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ادب کو خطرہ سائنس سے نہیں؛ بلکہ مغرب میں اسے خطرہ ''تجدد'' سے مشرق میں اسے خطرہ ''اندھی تقلید'' کی وجہ سے ہے۔ وہ اپنے ایک اداریہ ''ادب کا مستقبل'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ادب کے مستقبل کو خطرہ سائنس سے نہیں، درحقیقت جدّت اور تجربے کے نام پر کی گئی ان بدعنوانیوں اور دھاندلیوں سے ہے، جو کلاسیکی روایات سے بیگانہ ہو کر تقریباً نصف صدی کے اندر شاعری، افسانہ وناول اور تنقید میں زور وشور سے روا رکھی گئی ہیں۔ فن پر یہ غارت گری مغرب میں بھی ہوئی ہے، مشرق میں بھی، فرق صرف یہ ہے کہ مغرب میں تجدد سے کام لیا گیا ہے اور مشرق میں فقط اندھی تقلید ہوئی ہے۔ گُم رہی کی حد یہ ہے کہ مشرق کی بازیافت کا نعرہ بھی اس تقلید سے خالی نہیں؛ بلکہ یہ بازیافت بھی شروع ہی میں مغرب کے حوالے سے کی گئی اور بعد میں بھی اصل سرچشموں تک براہ راست رسائی نہیں ہوئی، حالاں کہ شبلی کی معرکہ آرا کتاب ''شعرالعجم'' نے صحیح راستہ دکھا دیا تھا اور ان کی تصنیف ''موازنہ انیس و دبیر'' نے اس راستے پر چل کر ایک مثال بھی قائم کر دی تھی''۔

(''مریخ''، مارچ۔ستمبر 2004ء، صفحہ۔4)

پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے اداریے اور مضامین سے ''مریخ'' کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ مختلف ادبی اور لسانی مسائل پر گفتگو کر کے انہیں حل کرنے کی راہ ہموار کی اور اردو ادب کو وہ معیار عطا کیا، جو بہار میں ماضی کے دوسرے رسائل ادا نہ کر سکے، جب تک ''مریخ'' شائع ہوتا رہا، پروفیسر عبدالمغنی پابندی سے اداریہ لکھتے رہے۔

❋

پروفیسر عبدالمغنی کے تبصرے

''مریخ'' کے تقریباً تمام شمارے میں کتابوں پر پروفیسر عبدالمغنی کے تبصرے ''ع۔م'' کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے۔ اس طرح تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ پروفیسر عبدالمغنی نے تبصرہ نگاری میں بھی اپنا ایک مقام بنایا۔ ''مریخ'' کے بیشتر شمارے ایسے ہیں، جن میں صرف اُن کے ہی تبصرے ہیں، جن کی تعداد ہر شمارے میں درجن سے کم نہیں ہے۔ اُن کے تبصرے کو اگر ترتیب دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ میرے خیال میں پورے ملک میں پروفیسر عبدالمغنی ایسے واحد مبصر ہیں، جن کے تبصرے اتنی کثیر تعداد میں کسی رسالے کی زینت بنے ہیں۔ میرے سامنے ''مریخ'' کے دو شمارے (ستمبر۔دسمبر 1988ء اور جولائی۔اکتوبر 1991ء) ہے۔ دونوں شماروں میں چودہ (۱۴) چودہ (۱۴) کتابوں پر صرف ان کے ہی تبصرے ہیں۔ غالباً زیادہ کتابوں پر تبصرہ لکھنے کی وجہ سے اُن کے بعض تبصرے کتاب کے محض تعارف تک ہی محدود رہ گئے ہیں۔ اِن میں تبصرے کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ ''مریخ'' کے مارچ۔ستمبر 2004ء کے شمارے میں 18 کتابوں پر پروفیسر عبدالمغنی نے ''تبصرے'' کے تحت اپنی رائے پیش کی ہے۔ یہ رائے چند ہی کتابوں پر ہے۔ انہوں نے زیادہ تر کتابوں کا صرف تعارف کرایا ہے۔ مثلاً ''گلدستہ'' کے تعلق سے انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''معین کوثر صاحب نے ادبی مرکز پٹنہ کے طرحی مشاعروں کی غزلوں کا ایک مجموعہ مذکورہ بالا عنوان سے مرتب کیا ہے، ان میں جن شاعروں کے کلام کے مصرعے

دیے گئے ہیں، ان میں بہزاد فاطمی، رمز عظیم آبادی، انیس امام، کلیم عاجز، عطا کاکوی، رضا نقوی واہی، اعجاز علی ارشد، اختر عظیم آبادی، اثر فریدی، معین تابش، خورشید اکبر، احمد تبسم، شاکر آروی، فیاض الرحمٰن شارق، شہزاد معصومی، شمیم احمد شمیم، رشید عارف، افتخار عاکف، ارمان نجمی، معین کوثر، ناشاد اورنگ آبادی، خالد عبادی۔ پیش کش عمدہ، قیمت نامعلوم، پتہ ادبی مرکز، نزد بار ایسوسی ایشن، سیٹی کورٹ پٹنہ۔ 7''۔

اسے تبصرہ نہیں کہیں گے؛ بلکہ یہ کتاب کا مختصر تعارف ہے۔ اس شمارے میں ''گلدستہ'' کے علاوہ جن کتابوں کا پروفیسر عبدالمغنی نے تعارف کرایا ہے، ان میں ''شوخ بیانی'' (شوکت جمال، کراچی پاکستان)، ''اردو شاعری کا احتجاجی شعور'' (ڈاکٹر مظاہر الحق)، ''شب تاب'' (شاہ حسین نہری)، ''اگر روشنی نہ ہوتی'' (بدرالدین بدر اورنگ آبادی)، ''اردو صحافت بہار میں'' (ڈاکٹر سید احمد قادری)، ''انجم مانپوری فن کار سے فن تک'' (ڈاکٹر سید احمد قادری)، ''اسلحے، سکے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات'' (ڈاکٹر واحد نظیر)، ''تلوک چند محروم۔ ایک مطالعہ'' (کامل بہزادی)، ''ممبئی سے بھوپال تک'' (عبدالقوی دسنوی)، ''پنجاب اور ہریانہ کی تاریخی مساجد'' (مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی)، ''ادب گاہسیت زیر آسماں'' (ناوک حمزہ پوری)، ''مزید ڈرائیو'' (شرجیل احمد خاں)، ''عصر قدیم'' (انجینئر محمد فرقان سنبھلی)، ''بے پردہ'' (نعمان ہاشمی)، ''آر ایس ایس۔ایک مطالعہ'' (حارث بشیر)، ''تحصیل و ترسیل'' (محمود عالم)، ''اعتبار نظر'' (ڈاکٹر قاسم فریدی) شامل ہے۔ اس میں صرف ایک مونوگراف پر کمال جعفری کا تبصرہ ملتا ہے۔ اسی طرح جب میں نے ''مریخ'' کے اگست۔ ستمبر 1986ء کے شمارے پر نگاہ ڈالی تو اس میں 8 کتابوں پر پروفیسر عبدالمغنی کے تبصرے ملے۔ ان کے علاوہ اس شمارے میں مختلف کتابوں پر عبدالمتین، سید احمد قادری، جمیل اختر اور افتخار عظیم چاند کے تبصرے کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کے تبصرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تبصرہ کرتے وقت مصنف یا مرتب کا تعارف بھی کراتے ہیں اور ان کا نقطۂ نظر بھی واضح کر دیتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''نقد حرف'' پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''پروفیسر ممتاز حسین اردو کے اُن معدودے چند ناقدوں میں ایک ہیں، جو کافی مطالعہ و تفکر سے کام لیتے ہیں اور سالہا سال سے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے مطابق تنقید

ادب کے فکر انگیز نمونے پیش کرتے رہے ہیں، اگرچہ بعض اوقات وہ اپنے مباحث کو ان کے منطقی نتائج تک نہیں لے جاتے، یا اپنا موقف پورے طور پر واضح نہیں کر پاتے۔ بہر حال وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں، اپنے سوچے سمجھے ہوئے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور دوسرے ناقدین بالخصوص مغربی اُدبا کے اقوال بھی جا بہ جا درج کر کے ان کی تشریح کرتے ہیں''۔

(''مریخ''، اگست۔ دسمبر 1986ء، صفحہ۔ 53)

اس کے بعد کتاب پر تبصرہ آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح اسی شمارے میں معروف شاعر اویس احمد دوراں کے مجموعۂ کلام ''ابابیل'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی تنقیدی بصیرت کا جس طرح اظہار کیا ہے اُسے ملاحظہ کیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''.... دوراں ایک ترقی پسند بہ معنی اشتراکی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا انداز مشہور اشتراکی شاعر سردار جعفری جیسا ہے۔ سردار ہی کی طرح وہ بھی بالکل سیاسی؛ بلکہ فوجی قسم کی آزاد نظمیں لکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر زیر نظر مجموعے کی یہ نظمیں بھوکی نسل کا ترانہ، نئی پود، پکی روشنائی، وطن کی دل رُبا گلیوں میں، کارل مارکس صدی کے نام، آگے بڑھو۔ ان نظموں میں فکر کا زور و شور جو بھی ہو، فنی تجربہ کامیاب نہیں۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت میں روانی اور جولانی ہے۔ وہ اپنے خیالات چاہے تو شاعرانہ و فنکارانہ اسلوب سے بھی پیش کر سکتا ہے؛ اس لیے کہ وہ چند نقوش شاعری کے استعمال پر قادر نظر آتا ہے؛ لیکن اگر مجموعے میں فقط یہ آزاد نظمیں ہی ہوتیں تو اس پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ تبصرے کی طرف مائل کرنے والی حسب ذیل پابند نظمیں ہیں۔ تہہ خنجر، گلاب کی موت، دشت تپاں، ارتقا۔ چند نظمیں مخلوط نسل کی معلوم ہوتی ہیں، جن میں قافیہ و ردیف کی آئین پسندی کہیں ہے اور کہیں نہیں، جیسے فن ذرا ڈرتے ڈرتے آئین شکنی کر رہا ہو، جیسے ''آئینے ٹوٹ رہے ہیں'' اور ''خواب''....''۔

(ایضاً۔ صفحہ۔ 55)

''مریخ''، ستمبر 1994ء میں پروفیسر عبدالمغنی کے سات (۷) اور پروفیسر اعجاز علی ارشد کے دو (۲) تبصرے شامل ہیں۔ جون 1996ء کے شمارے میں بھی پروفیسر عبدالمغنی کے

سات (۷) تبصرے ہیں۔ اسی شمارے میں خورشید اکبر کے مجموعۂ کلام ''سمندر خلاف رہتا ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

''جواں سال شاعر خورشید اکبر صاحب کا یہ مجموعۂ کلام اپنے نام کے اعتبار سے ایک استعارے پر مبنی ہے، جس کی طرف اشارہ مجموعے کی ایک غزل کے حسب ذیل شعر میں کیا گیا ہے۔

سلگتی پیاس نے کر لی ہے مورچہ بندی
اسی خطا پہ سمندر خلاف رہتا ہے

سمندر میں پیاسے کا یہ استعارہ عصر حاضر کی انسانیت بالخصوص بڑی طاقتوں، ارباب اقتدار اور دنیا کے سیاسی اجارہ داروں پر ایک طنز ہے۔ اس طنز میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ بقول اقبال 'زمانے کے انداز بدلے گئے' یعنی اب طاقت کے جبر وستم کا طلسم ٹوٹ رہا ہے؛ اس لیے کہ پیاسوں نے مجبور ہو کر اس کے خلاف مورچہ بندی کر لی ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں ظالم اور مظلوم کے درمیان ایک کشمکش برپا ہے، جس کی وجہ سے ظلم کا محیط سمندر مظلوموں کے خلاف زیادہ سے زیادہ بپھرتا جا رہا ہے''۔

(''مریخ''، شمارہ جون 1996ء، فکشن نمبر، صفحہ۔68)

اسی طرح ''مریخ'' کے تقریباً ہر شمارے میں پروفیسر عبدالمغنی کے تبصرے اور کتابوں کا تعارف شائع ہوتا رہا، جس سے اردو ادب کے طلبا خاص طور پر استفادہ کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ''مریخ'' کے بند ہونے تک جاری رہا۔ یہ تبصرے پروفیسر عبدالمغنی کی فن اور علمی بصیرت کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں۔

مختلف شخصیات پر پروفیسر عبدالمغنی کی تحریریں

پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی پوری زندگی درس وتدریس اور اردو زبان وادب کی خدمت میں گذاری۔ قلم وکاغذ سے ان کا رشتہ آخر وقت تک منقطع نہیں ہوا۔ جب تک زندہ رہے، اردو کے لیے سوچتے رہے۔ ''مریخ'' کے علاوہ ان کے سیکڑوں ادبی اور تنقیدی مضامین ہندوستان پاکستان کے مختلف رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ وہ ماہر اقبالیات تو تھے ہی، مختلف اصناف ادب پر بھی اُن کی بڑی گہری نگاہ تھی۔ شخصیات کے تعلق سے اُن کی جو تحریریں ملتی ہیں، اُن میں بھی ایک خاص رنگ اور فکر ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، آل احمد سرور، جگر مرادآبادی، مجروح سلطان پوری، حکیم عبدالحمید جیسے مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے اکابر کی حیات وخدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی فکر کے مختلف گوشوں پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے، وہ قابل غور ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی جس طرح علامہ اقبال کے مداح تھے، اسی طرح وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی پسند کرتے تھے۔ یہ دو شخصیتیں ایسی تھیں، جن پر وہ تنقید برداشت نہیں کرتے تھے۔ 13 نومبر 1988 کو ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی میں نکھیل چکرورتی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں مولانا کے بارے میں کچھ قابل اعتراض باتیں لکھی گئی تھیں، اس تناظر میں پروفیسر عبدالمغنی کی ایک تحریر ''مولانا ابوالکلام آزادؒ کے عنوان سے ''مریخ'' میں ملتی ہے، جس میں انہوں نے مولانا آزاد کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"نمبر دو کا شوشہ ۱۳؍نومبر ۸۸ء کو نکھیل چکرورتی نے ٹائمز آف انڈیا کے اپنے سنڈے کالم میں چھوڑا ہے۔ ان کی منطق یہ ہے کہ ہمایوں کبیر اردو نہیں جانتے تھے اور مولانا انگریزی پر دسترس نہیں رکھتے تھے، لہٰذا معلوم نہیں کہ مولانا نے کیا کہا اور ہمایوں کبیر نے کیا لکھا؟ بلکہ ہوا یوں کہ مولانا نے کچھ کہا اور ہمایوں کبیر نے کچھ اور لکھا۔ یہ منطق بالکل لغو ہے اور اس بات کا ثبوت کہ چکرورتی کا دماغ چکرا گیا ہے، چناں چہ وہ ہذیان میں مبتلا ہو گیا ہے، اس نادان کو جاننا چاہیے کہ ہمایوں کبیر بہت اچھی طرح اردو جانتے اور سمجھتے تھے اور مولانا انگریزی پر اتنا عبور رکھتے تھے کہ نہ صرف اس زبان میں کتب و رسائل کا مطالعہ کرتے تھے؛ بلکہ کانگریس کے اجلاسوں میں تجویزوں کے ڈرافٹ سے لے کر کیبنٹ مشن کے انگریز ارکان کے ساتھ گفت و شنید تک میں وہ بلا تکلف انگریزی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا ونس فری ڈم کے مسودے میں انہوں نے جا بہ جا اصلاحات بھی کی تھیں۔۔۔"

("مریخ"، شمارہ ستمبر۔دسمبر 1988ء، صفحہ۔5)

اپنے ایک مضمون میں پروفیسر عبدالمغنی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے "اسلوب نگارش" پر بھی گفتگو کی ہے اور مولانا کے اسلوب کے ارتقا کے تین مرحلے کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پہلا مرحلہ مولانا کے زیرِ ادارت پندرہ روزہ "لسان الصدق"، کلکتہ کے دور سے ۱۹۰۳ء میں سامنے آتا ہے۔ دوسرا مرحلہ ۱۹۱۲ء میں "الہلال" کلکتہ کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے اور طرزِ آزاد کے ارتقا کا تیسرا اور آخری مرحلہ ۱۹۱۶ـ۱۹ء میں مولانا کی رانچی میں نظر بندی کے دوران لکھی ہوئی تصنیف "تذکرہ" کے آخری باب سے شروع ہو کر ۱۹۳۱ء میں "ترجمان القرآن" کی اشاعت اور ۱۹۴۴ـ۴۵ء میں قلعہ احمد نگر کے قید خانے میں تحریر کیے ہوئے مجموعۂ مکاتیب "غبارِ خاطر" پر ختم ہوتا ہے۔

(دیکھیے "مریخ"، شمارہ مارچ۔ستمبر 2004ء، صفحہ۔7-6)

آل احمد سرور اس لیے ناقص ناقد مشہور تھے کہ تنقیدی موضوع پر ان کی کوئی تصنیف منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اس کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی نے ان کو ناقدِ کامل قرار دیا اور لکھا کہ:

"جناب آل احمد سرور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی خاص تنقیدی موضوع پر مستقل تصنیف نہیں پیش کی ہے، لہٰذا وہ ناقص ناقد ہیں۔ یہ ایک غلط بات ہے؛ اس لیے کہ تنقید کا کوئی معیار اس شرط پر زور نہیں دیتا کہ نقاد کو مختلف مضامین سے آگے

بڑھ کر مستقل کتابوں کا مصنف بھی ہونا چاہیے۔ تاریخ ادب میں ایسے عظیم نقادوں کی کمی نہیں، جنہوں نے صرف مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں مثال عصر حاضر کے عظیم ترین نقاد ٹی ایس ایلیٹ کی ہے، جس نے کسی ادبی موضوع پر کوئی تنقیدی کتاب کبھی نہیں لکھی اور اس کا سرمایہ جو کچھ ہے، متفرق موضوعات پر مقالات کی شکل میں ہے"۔

("مریخ"، شمارہ جولائی۔اکتوبر 1991ء، صفحہ۔9)

اس کے بعد پروفیسر عبدالمغنی نے اپنے پندرہ سال پہلے کے مقالے "آل احمد سرور کی تنقید نگاری" کے حوالے سے تحریر کیا کہ!

"سُرور نے انگریزی کے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی طرح اپنے مضامین و مقالات ہی سے وہ کام کر ڈالا ہے، جو دوسرے لوگ کتابیں اور تصنیفیں مرتب کر کے نہیں کر پائے ہیں۔ کسی بھی کام میں اصل اہمیت مقدار کی نہیں، معیار کی ہے، جو سُرور نے نہ صرف اپنی تنقید میں پیش کیا ہے؛ بلکہ اردو ادب میں قائم کیا ہے"۔

(بحوالہ "تشکیل جدید"، 1976ء، صفحہ۔171)

پروفیسر عبدالمغنی نے جگر مرادآبادی کو "وجدانی شاعر" کہا ہے اور لکھا ہے کہ "ان کے کلام کی بے ساختگی، سرمستی، سرجوش، والہانہ پن اور ولولہ انگیزی کا راز یہی ہے۔ وہ اپنے ایک مقالہ "جگر مرادآبادی کی شاعری کی اہمیت" میں لکھتے ہیں کہ:

"جگر وسیع ترین معنوں میں دردِ جگر کے شاعر ہیں۔ ان کے دل پر چوٹ عام، یا خاص، ذاتی، یا آفاقی مفہوم میں حُسن نے لگائی ہو، یا زمانے نے، اُن کا کلام ایک دردمند دل کی پکار ہے، یہ ایک نالۂ عشق ہے، جو نغمے کی صورت میں ڈھل چکا ہے۔ جگر کی طبیعت کا وفور اور سُرور دونوں دردِ دل کی وجہ سے ہے۔ یہ صحیح معنوں میں تغزل کے سوز و گداز کا کرشمہ ہے، اسی تغزلانہ سوز و ساز کے سبب جگر کی ہر غزل اور ہر نظم میں ایک سرور کی کیفیت ہے۔ یہ شاعری ہے کاری گری نہیں۔ اس کی شعریت نئی نسل کو جگر کا ایک تحفہ ہے اور عصرِ حاضر کے لیے یہی اس کی معنویت اور اہمیت ہے۔۔۔"

("مریخ"، اگست۔دسمبر 1997ء، صفحہ۔10)

پروفیسر عبدالمغنی نے مجروح سلطان پوری کی غزلوں پر بھی اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ان غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجروحؔ تخیل کی باریکی اور احساس کی لطافت کے ساتھ الفاظ کی ترتیب اور تراکیب کے استعمال کا ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں، جس میں دقتِ نظر اور نفاستِ بیان دونوں کا امتزاج ہے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر بڑے اختصار و ایجاز کے ساتھ، صرف چند پیکروں میں اپنے خیالات و جذبات کی تمام وسعتوں اور شدتوں کو نچوڑ دیتے ہیں۔ اس اسلوبِ سخن کے محرکات کتنے ہی رومانی ہوں، اس کے مظاہرے میں کلاسیکیت نمایاں ہے۔ میرے خیال میں تغزل کا یہ اندازِ فن کی استقامت کی دلیل ہے اور اس سے طرزِ مجروح کی شاعرانہ ندرتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ فنِ غزل گوئی کی یہ استواری مجروحؔ کے مجموعۂ کلام 'غزل' کے دوسرے بہتیرے اشعار میں نمایاں ہے"۔

("مریخ"، شمارہ جون۔اگست 2000ء، صفحہ۔7)

پروفیسر عبدالمغنی نے جہاں شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت و خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہیں سیاست اور طبابت کے شعبے سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کے کارناموں کو بھی اجاگر کیا اور ان کے تعلق سے اپنی مثبت رائے بھی پیش کی۔ ملک کے مشہور و معروف طبیب حکیم عبدالحمید سے اپنی ملاقات کی یاد تازہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی نے لکھا ہے کہ:

"۹۰ء میں میں سخت بیمار ہو گیا اور بہ یک وقت کئی امراض میں مبتلا، قدرے صحت مند ہونے کے بعد حسب معمول کسی جلسے میں دلّی آیا تو حکیم الحمید صاحب سے رابطہ کرلیا؛ تاکہ ان سے اپنے بارے میں طبی مشورہ کروں۔ انہوں نے بلا تاخیر مجھے آصف علی روڈ کے ایک مرکزِ صحت مند میں وقت دیا۔ وہاں میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ ہزاروں کا ہجوم ہے۔ معلوم ہوا کہ اسی طرح وہ روزانہ دلّی اور غازی آباد کے اپنے مختلف مراکز میں مریضوں کا معاینہ کرتے ہیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب میں نے دوبارہ اپنے ایک دوسرے سفر میں ان سے ملاقات کا وقت طلب کیا تو پھر انہوں نے مجھے آصف علی روڈ ہی میں بلایا؛ مگر بجائے صبح اور معمول کے دنوں کے شام کا وقت رکھا۔ میں جب مقررہ جگہ پر پہنچا تو وہاں سناٹا تھا اور صرف چند کارکن موجود تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ حکیم صاحب اس وقت صرف مجھ سے ملنے کے لیے غازی آباد سے آئیں گے اور وہ بالکل وقت پر آ گئے۔ تنہائی میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ میرے تمام مطبوعہ اردو و انگریزی مضامین کی فائل بنوا کر انہوں نے اپنے کتب خانے میں محفوظ رکھی ہے۔ اس انکشاف سے میں نے ان کے وسیع

مطالعے اور متنوع موضوعات سے دلچسپی کا اندازہ کیا۔ معلوم نہیں، ان کے کتب خانے میں موجودہ صدی کے مزید کتنے علمی خزانے پائے جاتے ہیں، اس پر تحقیق ہونی چاہیے"۔

("مریخ"، شمارہ جنوری۔مئی 2000ء، صفحہ۔6)

پروفیسر عبدالمغنی نے "مریخ" میں ایک طرف جہاں مختلف شخصیات پر مضامین قلمبند کیے ہیں، وہیں اس کے علاوہ انہوں نے برناڈ شاہ (1976)، مولانا مودودی، (1989)، قرۃ العین حیدر (1991)، ٹیپو سلطان (1991)، اورنگ زیب (1992)، محمود غزنوی (1993) اور فیض احمد فیض (2001) جیسی عبقری شخصیتوں پر باضابطہ کتابیں بھی لکھیں۔ انہوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں پر بھی توجہ دی، جنہیں لوگوں نے دانستہ، یا نادانستہ طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ ان میں مشہور افسانہ نگار شین مظفر پوری بھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنہیں اردو کے نقادوں نے وہ مقام نہیں دیا، جو اُنہیں ملنا چاہیے تھا؛ لیکن پروفیسر عبدالمغنی نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے شین مظفر پوری اور اُن کے فن پر ایک جامع مقالہ قلمبند کر کے اُن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی سے ڈاکٹر نسیم اختر نے ایک تفصیلی انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے پروفیسر عبدالمغنی سے دریافت کیا تھا کہ اورنگ زیب، ٹیپو سلطان، یا محمود غزنوی پر آپ کی جو کتابیں ہیں، ان کے محرکات کیا تھے؟ اس سوال کے جواب میں پروفیسر عبدالمغنی نے کہا تھا کہ:

"یہ تاریخی کتابیں ہیں۔ اگر چہ اورنگ زیب پر کتاب مختصر ہے؛ لیکن اس میں جو مواد میں نے پیش کیا ہے، وہ دیکھنے کا ہے کہ اورنگ زیب میں جو بہت مشہور مورخ سمجھے جاتے ہیں سر جادو ناتھ سرکار، میں نے ان پر سخت تنقید کی ہے اور دستاویزی طریقے پر دکھایا ہے کہ انہوں نے غلط تعریف کی ہے اورنگ زیب کے بارے میں۔ ایک مثال تو یہ ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی محمود غزنوی ہیں، یا ٹیپو سلطان ہیں، ان پر جو کچھ بھی لکھا ہے، اگر کوئی غلط مواد میرے سامنے ہے تو میں نے اس پر تنقید بھی کی ہے اور کچھ soruce کے حوالے پیش کیے ہیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں کیوں وہ صحیح ہے اور دوسرے لوگوں نے جو لکھا ہے، کیوں وہ غلط ہے، اس کا میں نے تجزیہ کیا ہے، تحقیق کی ہے اور حوالے دیے ہیں وہ اپنی جگہ ہے"۔

("باتیں" (انٹرویو کا مجموعہ) ڈاکٹر نسیم اختر، صفحہ 94)

پروفیسر عبدالمغنی کی منتخب تحریریں

ادبی تنقید

ادب کی وہ جانچ پرکھ جو ادبی انداز سے ہو، ادبی تنقید ہے۔ یہ جانچ پرکھ درحقیقت ایک قدر شناسی ہے؛ یعنی اس میں ادب کی قدر و قیمت، اس کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور یہ اندازہ ادبی اصولوں اور قدروں کی روشنی میں ایک معیار کے مطابق، ایک سنجیدہ و باوقار اسلوب سے ہوتا ہے۔ اس قدر شناسی کا مطلب و مقصد قارئین کو کسی پارۂ ادب کی خوبی و خامی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ اس سے بہ یک وقت قارئین و مصنفین دونوں کے ذوق و شعور کی تربیت، یا پرورش ہوتی ہے، ایسے اہم کام کے لیے ضروری ہے کہ ناقد کا نقطۂ نظر مثبت، معروضی اور تعمیری ہو۔

ادبی تنقید کے تین مراحل ہوتے ہیں: (اوّل) پارۂ ادب کے مفہوم کی تشریح اور اس کے مضمرات کا تجزیہ۔ (دوم) دوسرے پارہ ہائے ادب سے اس کا موازنہ۔ (سوم) پارۂ ادب کی قدر و قیمت اور اہمیت کے متعلق فیصلہ۔

یہ تینوں کام اس ترتیب سے مکمل ہوتے ہیں کہ سب سے پہلے کسی صنف ادب میں متعلقہ پارۂ ادب کی ہستی کا تعین کیا جاتا ہے، مثلاً وہ شاعری ہے، یا افسانہ؟ اور کس حد تک اپنی متعلقہ صنف ادب کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے؛ یعنی اس کی حقیقت و نوعیت کیا ہے؟ یہ تعین ظاہر ہے کہ ہیئت اور تکنیک کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے بعد سوال اٹھتا ہے کہ زیر مطالعہ پارۂ ادب کی

اہمیت، یا حیثیت کیا ہے؟ کس درجے اور مرتبے کا پارۂ ادب ہے؟ اور اس میں عظمت کا وجود، یا پیمانہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب تہذیبی نقطۂ نظر سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

یہ تہذیبی نقطۂ نظر دراصل اقدار حیات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مطابق ناقد کو دیکھنا چاہیے کہ ایک پارۂ ادب کا کیا مفہوم معاشرے کے لیے ہے؟ وہ کس حد تک انسانیت کے لیے مفید ہے؟ اور اس سے ذوق و شعور، یا ذہن و کردار پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ادب میں تہذیبی، یا کہنا چاہیے ادبی قدروں کی یہ تلاش فی الواقع اخلاقی قدروں کی جستجو ہے اور جب تک کوئی ادب پارہ فن کی جمالیات کے ساتھ ساتھ فکر کی اخلاقیات کا حامل نہیں ہوگا، اس کی اہمیت و عظمت کا سراغ نہیں ملے گا۔ یہ درحقیقت ادب میں فکر و فن کی ہم آہنگی کا سراغ لگانا ہے۔ بلاشبہ ادب برائے زندگی کی بات ہے اور اس میں ادب کی افادیت کا نکتہ بھی مضمر ہے؛ لیکن زندگی سے ناوابستہ اور افادیت سے خالی، یا اس کے خلاف ہو کر کوئی ادب ادب باقی نہیں رہ جاتا۔ ادب کی لطافت اس کی افادیت میں ہی پوشیدہ ہے اور افادیت کے ساتھ ہی، نہ کہ اس کے بغیر، ادب تہذیب کا ایک عنصر یا عامل بن جاتا ہے۔

تنقید کے عمل کے ساتھ ہی اس کے اسلوب کو بھی محکم و متین ہونا چاہیے، اس میں سنجیدگی اور وقار کا ہونا ضروری ہے؛ اس لیے کہ تنقید کوئی ہلکی پھلکی انشائیہ نگاری، یا معمولی قسم کی مزاحیہ نگاری، یا تفریحی افسانہ نگاری نہیں ہے، اس میں حقائق کی وضاحت کے لیے ایک واضح قسم کی فصیح و بلیغ انشا پردازی سے کام لیا جاتا ہے۔ ناقد مصلح ہو، یا نہیں ہو، ایک ادبی مفکر ضرور ہوتا ہے اور فکر کے ابلاغ کے لیے بامعنی، بامقصد، صاف و صریح، مربوط و منظّم اور پراثر طرز تحریر مطلوب ہے۔

(''مریخ''، ستمبر۱۹۹۴ء صفحہ۔۱۳)

ساختیات ہے کیا؟

کہا جاتا ہے کہ ساختیات انگریزی لفظ Structuralism کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک اصطلاح سی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اسے ادب کا کوئی نظریہ، یا رجحان قرار دینا صحیح نہیں۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ انگریزی میں بہت پہلے عملی تنقید کے امام آئی، اے، رچرڈز نے اپنی مشہور کتاب Practical Critcism میں ایک لفظ Architectonics استعمال کیا تھا، جس کا ایک ترجمہ، قدرے ناقص سہی، ساختیات بھی کیا جا سکتا ہے؛ اس لیے کہ اس کا مفہوم ہیئت ادب کی تعمیر و تشکیل

ہے؛ یعنی کسی ادب پارے کی ظاہری شکل وصورت، ساخت اور بناوٹ۔ اردو میں جناب کلیم الدین احمد کی پوری تنقید اسی پر مبنی تھی اور انہوں نے اپنی ایک کتاب کا نام ہی ''عملی تنقید'' رکھا، جب کہ جناب احتشام حسین کی بھی ایک کتاب کا نام ''تنقید اور عملی تنقید'' ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو میں عملی تنقید کی روایات بہت پرانی ہیں۔ قدیم تذکروں میں یہی چیز پائی جاتی تھی اور علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ''موازنۂ انیس و دبیر'' تو عملی تنقید کی ایسی عظیم الشان تصنیف ہے، جس کی کوئی مثال انگریزی ادب میں بھی نہیں۔ اس لحاظ سے ساختیات ایک پرانی شراب ہے، جو نئی بوتل میں نئے لیبل کے ساتھ پیش کی جارہی ہے، گرچہ عملی تنقید کے اعتبار سے اس میں ایک آنچ کی کسر ہے؛ اس لیے کہ عملی تنقید کا پورا مفہوم یہ ہے کہ کسی، یا چند اصولِ تنقید کا اطلاق ایک ادبی تخلیق پر کیا جائے، جب کہ ساختیات کا لفظ صرف ظاہری ساخت اور بناوٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بہرحال، ساختیات مطلقاً ادب برائے ادب، یا فن برائے فن کے اس متروک تصور کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے، جو انیسویں صدی کے اواخر میں مریضانہ ذہن کے جمال پرستوں اور زوال پسندوں نے پیش کیا تھا۔ اس تصور کو مشہور ڈراما نگار جارج برنارڈ شا نے بیسویں صدی کے اوائل ہی میں اپنے شہرۂ آفاق ڈرامے ''مین اینڈ سوپر مین'' Man and Super man کے دیباچے میں بڑی حقارت کے ساتھ ردّ کردیا؛ لیکن اب اردو میں جدیدیت اور اسلوبیت وغیرہ کے زوال و انتشار کے بعد ساختیات کا کرتب مغرب سے اُدھار لے کر کچھ فن پرست دکھارہے ہیں، یہ ٹی، ایس، ایلیٹ کے کم عمر ہم عصر ایف۔ آر۔ لیوس کے تدریسی تخیل، یا طریقے Print on the page یعنی صفحے پر چھپی ہوئی تحریر کا بخیہ ادھیڑنے سے مختلف کوئی چیز نہیں، جس کا تجربہ کیمبرج میں لیوس کے شاگرد جناب کلیم الدین احمد زندگی بھر اردو میں کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ ساختیات کے نیم پختہ اور ناقص تنقیدی تصور سے تخلیق ادب کی دنیا میں کوئی نئی روشنی نہیں پھوٹتی؛ بلکہ اس پر تاریکی کا ایک اور پردہ پڑجاتا ہے، جو بجائے خود بوسیدہ و فرسودہ ہے۔

(''مریخ''، پٹنہ ۱۱ جنوری ۱۹۹۶ء صفحہ ۳)

ادب میں لغویات

ادب رُبہ زوال ہے، خواہ انگریزی ادب ہو یا اردو ادب یا کوئی اور ادب، کسی بھی زبان، ملک اور علاقے کا۔ یہ زوال صرف خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں، گرچہ جدید تکنیکی تمدن کے صنعتی ذرائع نشر

واشاعت نے ادب کی فنّی ہیئت پر اور سیاسی و معاشی نیز معاشرتی اسباب وعوامل نے فکری سانچے پر منفی وتخریبی اثرات ڈالے ہیں۔ زوال کا اصل سرچشمہ ادب تخلیق کرنے والوں کی ذہنی کم مائیگی اور فنی کم زوری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر انگریزی میں تخلیقی ادب کا ارتقا مجموعی اور عمومی طور پر انیسویں صدی کے بعد رُک گیا۔ وکٹورین عہد کے بعد نہ تو کوئی بڑا شاعر پیدا ہوا نہ بڑا ناول نگار۔ بیسویں صدی میں صرف بعض نثری ڈراما نگار، جیسے برناڈ شا، اور بعض تنقید نگار، جیسے ٹی، ایس، ایلیٹ نے درجۂ امتیاز حاصل کیا، ورنہ شاعری میں ٹینی سن اور براؤننگ کے مقابلے میں ایلیٹ اور ییٹس کی ہستی کیا ہے؟ اسی طرح ناول نگاری میں ڈکنز اور ہارڈی کے سامنے جیمز جوائس اور ورجنیا وولف کا مرتبہ کیا ہے؟

اردو ادب میں اقبال کے بعد بیسویں صدی کے چند غزل گویوں اور بعض پابند نظم نگاروں کو چھوڑ کر جن لوگوں نے آزاد نظم نگاری اور روایتی غزل گوئی میں دادِ سخن دی وہ بالعموم اور بیش تر ناقابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ صدی کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں صرف وہ فن کار اہمیت رکھتے ہیں، جنہوں نے تجریدی اور اساطیری مہملات سے دامن بچایا ہے۔ تحقیق کے دائرے میں معدودے چند ماہرین ہی نمایاں ہوئے ہیں، ورنہ یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالات اکثر و بیشتر ردی کی ٹوکری ہی کی زینت بن سکتے ہیں۔ تنقید کے نام پر جدیدی کہلانے والوں نے جو کھلواڑ کیا ہے، وہ ایک نمونۂ عبرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی کتابیں عام طور پر بازارِ ادب میں خریدی نہیں جارہی ہیں۔

اس ماحول میں چند نااہل اور مفاد پرست افراد نے جدید اردو ادب میں لغویات کا ایک چکر چلایا ہے، جس کا محرک و مقصود فقط اسٹنٹ بازی ہے۔ نئی نئی اصطلاحیں وضع کی جارہی ہیں، جو سب کی سب انگریزی الفاظ کے ناقص ترجموں پر مشتمل ہیں اور مغربی ادبیات سے مستعار بھی۔ اسلوبیات اور ساختیات کے ڈھنڈورے پیٹے گئے ہیں اور جب یہ ریکٹ ناکام ہوگیا تو اب مابعد جدیدیت کا ناقوس پھونکا جارہا ہے۔ یہ سب مانگے کا اجالا ہے اور تقلیدِ محض، جس میں نہ تو مطالعہ، واقفیت اور غور وفکر کو دخل ہے نہ مشق ومہارات کو۔ یہ بازارِ ادب میں کھوٹے سکّے چلانے کی ایک دیدہ دلیری ہے، اس سے صرف نئی نسلوں کی ذہنی الجھن بڑھ رہی ہے اور وہ ایک دماغی انتشار کا شکار ہورہی ہیں۔

اس تناظر میں پچھلے پچیس سال کی جدّت طرازیوں کو ادب میں لغویات کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟ آزاد شاعری اگر عروض کے مسلّمہ قواعد میں تحریف کرتی ہے تو اس کی شعریت، اگر وہ کسی معنے میں رومانی طور پر پائی بھی جائے تو اس تنظیم خیال سے یقیناً عاری ہے، جس میں نغمگی کا وہ عنصر ہوتا ہے، جو

درحقیقت جانِ شاعری ہے، خواہ بعض مغربی مفکرینِ ادب اور ان کے مشرقی مقلدین نغمگی کے خلاف کتنی ہی فلسفہ طرازی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض آزاد نظموں کا جزوی حسن عملاً قوافی کا مرہونِ منت ہوتا ہے، چاہے وہ قدیم ترایلیٹ کی ''دی ویسٹ لینڈ'' ہو، یا جدید ترفیض کی ''ملاقات''۔ تجریدی فکشن میں جیمز جوائیس کا مثالی ناول ''یولی سیز'' ایک پریشان خیالی ہے اور ''فنگیز ویک'' دیوانے کی بکواس۔ تنقید میں اسلوبیات ایک خام خیالی تھی اور ساختیات ایک کارِ عبث، جب کہ مابعد جدیدیت ایک طرح کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ یہ سب وہ رائج الوقت مہملات ہیں، جن کے سبب بیسویں صدی کے ایک بڑے حصے، بالخصوص دوسرے نصف میں، خاص کر اردو ادب کے اندر، ایک چیستانی فن کاری بھی ہوئی اور تنقید فن بھی۔

اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض حلقوں میں دانش ور کہلانے والوں کے درمیان بھی ماضی قریب کی ہرزہ کاریوں کا احساسِ زیاں ہونے لگا ہے اور متعدد افراد کی پیشانیاں سجدۂ سہو کے لیے مچل رہی ہیں، چناں چہ کچھ لوگ اظہار توبہ بھی کرنے لگے ہیں۔ یہ ادب کے لیے ایک اچھی علامت ہے اور اس سے مستقبل کی کچھ توقعات پیدا ہوتی ہیں۔ یہ موقع ہے کلاسکی ادب کی طرف رجوع کرنے اور اس کے فنی کمالات سے کچھ قیمتی سبق سیکھنے کا۔ ادب اور سماج دونوں میں کوئی بھی انفرادیت اپنی روایت سے بیگانہ ہو کر فروغ نہیں پا سکتی، لہٰذا خاص کر اردو ادب اگر عصری تقاضوں کی نتیجہ خیز عکاسی کے لیے انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے پہلے نصف کے باکمالوں کے کارناموں میں صحیح ذوق و شعور کے سرچشموں کی تلاش کرتا ہے تو آج اور آنے والے کل کے شعری و نثری ادب میں حقیقی حسن و جمال کا جلوہ بھی نظر آ سکتا ہے اور تہذیب کے لیے اس کی افادیت بھی آشکار ہو سکتی ہے۔

(''مریخ''، پٹنہ اگست۔ دسمبر ۱۹۹۷ء صفحہ۔۳)

رسمِ خط ہی زبان ہے

پچھلے دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب نے اپنی یونیورسٹی کے ایک جلسے میں ارشاد کیا کہ اردو کے رسم خط میں تبدیلی تحفظِ زبان کے لیے ضروری ہے۔ ان کا اشارہ لاطینی رسم خط اختیار کرنے کی طرف تھا۔ یہ آزاد ہندوستان میں اردو دشمنی کا نیا شوشہ ہے جو اور کہیں نہیں، خاص مسلم یونیورسٹی سے پھوٹا ہے:

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

مشورے میں انداز خیر خواہی کا ہے؛ مگر بات سراسر غلط اور یکسر نقصان دہ؛ بلکہ تباہ کن ہے۔ شاید نادان دوستی اسی کو کہتے ہیں، جو دشمن کی دانائی سے بھی زیادہ خطرناک بتائی گئی ہے۔ مشورہ دینے والے کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ علم و ادب سے ان کا رشتہ کیا ہے اور یہ بھی واضح نہیں کہ قومی و سماجی خدمات کے لیے ان کا وہ رکارڈ کیا ہے، جس کی بنا پر ناصح مشفق بننا وہ اپنا حق سمجھتے ہیں؟ ممکن ہے کہ وہ اپنے کو بہ جہت عہدہ دانش ور اور رہ نما دونوں تصور کرتے ہوں۔ اس خام خیالی پر تو صرف تبسم کیا جا سکتا ہے؛ لیکن مسئلہ ہے مشورے کی خطرناکی کا، گرچہ اردو پہلے ہی بہت سارے خطرات جھیل چکی ہے۔

آزاد ہندوستان میں اردو زبان اپنے رسم خط کے ساتھ چالیس سال سے زندہ و تابندہ ہے اور تمام مشکلات و تعصّبات کے باوجود اس کی رفتارِ ترقی رکی نہیں ہے، لہٰذا تحفظ کا وہ سوال تو سرے سے نہیں ہے، جس کا مفروضہ قائم کر کے وائس چانسلر صاحب نے نصیحت فرمائی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی بات بے وقت کی راگنی ہے، جہاں تک رسم خط کی بہتری کا تعلق ہے، عربی رسم خط کسی طرح لاطینی سے کم تر نہیں؛ بلکہ متعدد جہتوں سے بہتر ہے۔ خاص کر عصرِ حاضر کی برق رفتار زندگی میں اس کا اختصار زود نویسی میں بہت معاون ہے۔ صرف جدید طباعتی آلات پر لاطینی کی طرح ڈھلنے کی ایک کمی اس میں تھی، وہ بھی اب پوری ہو گئی ہے اور کمپیوٹرائزڈ پرنٹنگ کا جو طریقہ حال فی الحال عربی رسم خط کی طباعت کے لیے ایجاد ہوا ہے، وہ مستقبل قریب میں بہت ممکن ہے کہ اسے لاطینی سے بہت آگے لے جائے۔ رہی بات عربی، یا اردو حروف کی شکل سے ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت کی تو جس طرح محض اس کی وجہ سے ہم اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتے، زبان بھی نہیں چھوڑ سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربی الاصل اور فارسی سے بھی متاثر ہونے کے باوجود اردو کا رسم خط اس کا اپنا فطری طریقہ تحریر ہے؛ اس لیے کہ اس کے حروفِ تہجی عربی و فارسی حروف سے زائد ہیں، چناں چہ جو حروف تہجی اردو کے ہیں، وہ سب کے سب نہ عربی میں ہیں، نہ فارسی میں، پھر اردو اب محض زبان نہیں ہے، اس کا ایک بہت ترقی یافتہ ادب بھی پیدا ہو گیا ہے، جس کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے اور اس میں علوم و فنون کا جو خزینہ ہے، وہ سب اردو رسم خط ہی میں ہے؛ اس لیے کہنا چاہیے کہ اب رسم خط ہی زبان ہے، وہ جسم اردو کا فقط لباس نہیں، اس کی کھال ہے، جس کے ساتھ اردو زبان و ادب کا جسم پروان چڑھا ہے، لہٰذا ہم دنیا کی کسی طاقت کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہماری زبان

کی کھال ادھیڑ کر پلاسٹک سرجری سے کوئی مصنوعی کھال لگا دے۔ اس طرح تو ہماری زبان کا ارتقا اسی طرح رُک جائے گا، جس طرح عصرِ حاضر میں ترکی زبان اور چینی زبان کے ساتھ لاطینی رسمِ خط اختیار کرنے سے ہوا ہے۔

(''مریخ''، اگست تا دسمبر ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۳)

ادب کا مستقبل

انیسویں صدی کے اواخر میں جب آرٹس اور سائنس کی کش مکش یورپ میں زوروں پر تھی، انگریزی کے مشہور شاعر و ناقد میتھو آرنلڈ نے شاعری کے مستقبل کا سوال اٹھایا تھا اور جواب میں اشارہ کیا تھا کہ شاعری ایک برتر حیثیت سے باقی رہے گی؛ لیکن بیسویں صدی میں بعض انگریز مفکر نے آرٹس اور سائنس کے دو الگ الگ کلچر کی تفریق کر ڈالی اور ایک طرح سے سائنس کو آرٹس پر ترجیح دی۔ اب اکیسویں صدی کو نہ صرف ٹکنالوجی؛ بلکہ مابعد ٹکنالوجی کا زمانہ کہا جا رہا ہے۔ ٹکنالوجی سائنس کی عملی شکل ہے اور اس کا تعلق آلات سے ہے، جیسے آج کل میڈیا کی ٹکنالوجی میں ٹیلی ویژن کا چرچا گھر گھر میں ہے، انٹرنیٹ بھی اسی کی ایک صورت ہے۔

نشر و اشاعت کے یہ سارے ذرائع ابلاغ ادب کے مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ طباعت کا کاروبار بھی فروغ پر ہے اور پرنٹنگ پریس بکثرت رسائل و اخبارات اور کتابیں شایع کر رہے ہیں۔ یہ سب چیزیں بڑے پیمانے پر فروخت بھی ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اسٹوری، یا کہانی کا بازار بہت گرم ہے، خواہ وہ سیاسی قصّے ہوں، یا تخلیقی افسانے بالخصوص ناول جن کی بڑھتی ہوئی مانگ انہیں بہترین شیئ تجارت (Best Sellers) بنا رہی ہے۔ کیا اس صورت حال سے ادب کے مستقبل کی ضمانت ملتی ہے؟ یہ سوال بہت بحث طلب ہے اور اس کا جواب آسان نہیں۔

سی، پی، اِسنو نے آرٹس اور سائنس کے دو متضاد کلچروں اور سائنس کی برتری کا جو سوال اٹھایا تھا، وہ ہنوز جواب طلب ہے۔ سائنس پر مبنی ٹکنالوجی نے سوال کو ایک سخت مسئلہ بنا دیا ہے۔ ادب میں فکشن کی گرم بازاری اس مسئلے کو حل کرنے سے قاصر ہے؛ اس لیے کہ فن کی بہترین شکل اگر ادب ہے تو ادب کی بہترین شکل شاعری ہے؛ مگر شاعری کو آزاد نظم نگاری (Free Verse) نے

غارت کر دیا ہے۔ یہ حادثہ تو اصلاً فرانس میں verse libre کی شروعات سے رونما ہوا؛ لیکن ۱۹۲۲ میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے The Waste Land (خرابہ) آزاد نظم میں لکھ کر مغرب میں شاعری کی مسخ کر دیا، حالاں کہ نظم میں قافیہ پیمائی (Rhyming) بھی بکثرت ہے اور تشبیہ و استعارہ کے پیکر (Imagery) کی بھی کمی نہیں؛ مگر پابند کلاسکی نظم کی ہیئت توڑ کر پارہ پارہ کر دی گئی ہے۔ اس فن شکنی سے شعریت کا منظّم سانچہ مجروح ہوا ہے، جب کہ تقریباً اسی زمانے میں اقبالؔ نے اردو میں ''طلوعِ اسلام'' اور ''خضرِ راہ'' لکھ کر دنیا کے سامنے شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

اس تقابل سے مغرب پر مشرق اور انگریزی پر اردو کی فنی برتری کی ایک مثال شاعری میں ہمارے سامنے آتی ہے؛ لیکن اقبالؔ کے بعد فیضؔ نے ایلیٹ کی نقالی کر کے آزاد نظم نگاری کی صورت میں اردو شاعری کا معیار گرا دیا، حالاں کہ فیضؔ کی آزاد نظموں میں بھی قافیہ پیمائی ہی کی بہار ہے؛ مگر نظم کا مجموعی سانچہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے، جب کہ مجازؔ اور جذبیؔ نے آزاد نظم کی دلدل میں اپنے فن کو نہیں گرایا۔ بہر حال فیضؔ کی سیاسی مقبولیت نے اردو میں آزاد نظم کی لعنت کو ایک فیشن بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایلیٹ نے تو جنگِ عظیم اوّل ۱۸۔۱۹۱۴ء سے مغربی سماج میں رونما ہونے والے خرابے کو آزاد نظم کے پرخچوں سے آئینہ دکھایا تھا، جیسا نظم کے استعارات سے عیاں ہے؛ مگر فیضؔ اور ان کے مقلّدوں نے اس نکتے کو نہیں سمجھا، حالاں کہ خود ایلیٹ نے اپنے مشہور تنقیدی مقالے ''روایت اور انفرادی صلاحیت (Tradition and the Individual Talent) میں واضح کر دیا تھا کہ کوئی انفرادی تجربہ روایت کو ملحوظ رکھے بغیر معتبر و موثر نہیں ہو سکتا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ فیشن زدگی میں، یا کسی دوسرے غیر ادبی اغراض و مفادات کے تحت ایلیٹ نے اپنی نظم نگاری میں اپنے ہی تنقیدی شعور کی نفی اور اصولِ فن کی خلاف ورزی کی۔ یہ کچھ ویسا ہی عبرت خیز واقعہ ہے، جیسے مصوّر پکاسو کی ردّ کردہ مہمل تصویریں تجریدی آرٹ بن گئیں۔

یہ تجریدی آرٹ افسانہ، ناول میں در انداز ہوا تو اس نے بے ماجرائی کا گل کھلایا، جس کے سبب قصّے کی دلچسپی ختم ہو گئی اور مہمل قسم کی فلسفہ طرازی یا انشائیہ نگاری شروع ہو گئی۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی مرض تھا، جو دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ انگریزی میں اس کی عبرت خیز مثال جیمز جوائس کا ناول ''یولی سیز'' ہے۔ اس پاگل پن میں وہ یہاں تک بڑھا کہ ''فنے گنز ویک'' نام کا تقریباً ایک ہزار صفحات کا ایک بالکل لغو ناول لکھ مارا، جس کی ایک سطر کا مفہوم بھی سمجھنا ممکن نہیں؛ اس لیے کہ اس کا تعلق دنیا کی کسی زبان سے

نہیں، یہ لاطینی رسم خط میں صرف ایک بکواس ہے۔ یہ مکمل نمونہ ہے، اس بے ادبی کا جس کی ناقص مثالیں وہ ساری تحریریں ہیں، جنہیں ماؤف ناقدین مغربی ادب کے جدید نادر تجربات قرار دیتے ہیں۔

ایسے ہی ناقدین نے جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات اور مابعد ساختیات کے ریکٹ اور اسٹنٹ چلائے، یہ غیر تنقیدی حرکات جاہلوں نے اپنی علمیت کا ڈھونگ رچانے کے لیے کیں، ان خفیف حرکات کی بنیاد پر بدترین قسم کی گروہ بندیاں کی گئیں، اشتہار بازیاں ہوئیں، اداروں پر سازشی قبضے کیے گئے اور انعامات کی ریوڑیاں اندھوں کی طرح تقسیم کی گئیں، نتیجے کے طور پر علم وفن کا ماحول آلودہ ہوگیا، فضا مکدّر ہوئی، ہر طرف گندگی پھیل گئی۔ ادب کی آبروریزی ہوئی۔ فن ایک ایسا بے تکلف اور ناپسندیدہ تماشا بن گیا کہ قارئین اس کی کراہت سے بے زار اور فرار ہوگئے۔ اس طرح ادب کی تخریب کے بعد ناقدوں کی یہ ناٹک منڈلی اپنے مفادات کا شکار ہو کر آپس ہی میں لڑ اور بکھر رہی ہے، البتہ اس نے اپنا جو بلیک مارکٹ خاص کر بیرونی ملکوں میں فریب کاریوں سے بنایا ہے، اس کی منافع خوری سے دست کش نہیں ہونا چاہتی۔

ادب کے مستقبل کو خطرہ سائنس سے نہیں، درحقیقت جدّت اور تجربے کے نام پر کی گئی ان بدعنوانیوں اور دھاندلیوں سے ہے، جو کلاسکی روایات سے بیگانہ ہو کر تقریباً نصف صدی کے اندر شاعری، افسانہ وناول اور تنقید میں زور وشور سے روا رکھی گئی ہیں۔ فن پر یہ غارت گری مغرب میں بھی ہوئی ہے، مشرق میں بھی، فرق صرف یہ ہے کہ مغرب میں تجدد سے کام لیا گیا ہے اور مشرق میں فقط اندھی تقلید ہوئی ہے۔ گم رہی کی حد یہ ہے کہ مشرق کی بازیافت کا نعرہ بھی اس تقلید سے خالی نہیں؛ بلکہ یہ بازیافت بھی شروع ہی میں مغرب کے حوالے سے کی گئی اور بعد میں بھی اصل سرچشموں تک براہِ راست رسائی نہیں ہوئی، حالاں کہ شبلی کی معرکہ آرا کتاب ''شعرالعجم'' نے صحیح راستہ دکھا دیا تھا اور ان کی تصنیف ''موازنۂ انیس ودبیر'' نے اس راستے پر چل کر ایک مثال بھی قائم کر دی تھی۔

ادب فنون لطیفہ کی بہترین شکل ہے، اس کے مقابلے میں موسیقی ومصوری وغیرہ کی اہمیت بہت کم ہے۔ نطق انسان کی امتیازی خصوصیت اور علم اس کا آفاق شرف ہے، اس شرف کا اظہار حروف میں ہوتا ہے، لہٰذا بامعنی تحریر وتصنیف انسان کا تخلیقی کمال ہے؛ اسی لیے پیغمبروں پر نازل ہونے والے تمام صحیفے ادب عالیہ ہیں۔ ان آسمانی کتابوں نے ادبیات کی رہبری کی ہے۔ اس طرح ادب ایک قدرتی فن ہے، فطرت کا ایک مظہر ہے، اس کے مقابلے میں سائنس کے ایجادات

وانکشافات گویا مصنوعی ہیں، گرچہ ان کی تسوید بھی ادب کے حروف میں ہوتی ہے، جس کے بعد ہی ان کا اطلاق آلات میں ہوتا ہے، لہذا سائنس کی عملی شکل، مشینری، ایک خادم ہے ادب کے احکام ومقاصد کا، چناں چہ طباعتی ذریعۂ اشاعت (Medium) کے مقابلے میں سمعی و بصری ذرائع (Audio-visual media) کی حیثیت ثانوی ہے۔ اوّل تو فکر اصلاً ادب سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے، فن میں بھی اصلیت ادب کی ہے، خواہ اس کو آلات کی شکل میں پیش کیا جائے۔

ان ناقابلِ تردید حقایق کے باوجود اگر سائنس کے کلچر کو عصر حاضر میں کچھ لوگ ترجیح دیتے ہیں تو وہ درحقیقت کسی اصول کو مدنظر نہیں رکھتے، صرف کاروباری استعمال کو ملحوظ رکھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اس استعمال کا منبع ومرجع دونوں ادب اور اس کے فن سے تعلق رکھتا ہے؛ یعنی فن کی اس ہیئت سے جو تحریر پر مبنی ہے۔ تحریر، رقص وموسیقی وغیرہ کے لہوولعب سے الگ اور بلند تر، زندگی کی متانت، وقار، عظمت اور افادیت کی ضامن ہے۔ اس لحاظ سے ادب کی اوّلیت اور اہمیت ناقابلِ شکست ہے۔ سنجیدہ وبالیدہ ادب کو نہ سائنس ختم کر سکتا ہے، نہ اس کی ٹکنالوجی اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وہ اپنی ذات میں آپ مستقل، محکم اور پائیدار ہے؛ لیکن ہر تحریر ادب نہیں ہے۔ ادب کا ادب عالیہ (Classic) ہونا ضروری ہے۔ ایسا ہی ادب حقیقی، معیاری، حسین، پُر لطف اور مفید ہوگا۔ اس کے برخلاف جو بھی تجربہ ہوگا، وہ صرف تجربہ ہو کر رہ جائے گا، اس کے رومان کی کوئی روایت قائم نہیں ہوگی اور نہ اسے باذوق قاری نصیب ہوں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ بجلی کی طرح زمین پر گر کر بالآخر خاک سیاہ ہو جائے گا۔

بہر حال، ادب کو شدید خطرہ بیسویں صدی میں اس کے اندر رونما ہونے والے بعض ان رجحانات سے ہے، جو نئے تجربات کہے جاتے ہیں؛ لیکن درحقیقت کج فکری، پراگندہ خیالی اور اظہار وبیان پر عدم قدرت کے غماز ہیں۔ آزاد نظم، بے ماجرا افسانہ وناول اور عجوبہ پسند تنقید نگاری وہ مہلک امراض ہیں، جو ادب کو سرطان کی طرح اندر سے کھا رہے ہیں۔ یہ ہے تشخیص عصر حاضر میں ادب کے مسئلے کی۔ اس کے حل کی تلاش میں حسب ذیل نکات پر غور کرنا چاہیے۔

اوّل یہ کہ روایت کو نظر انداز کر کے کوئی تجربہ نہیں کیا جائے؛ اس لیے کہ زبان وبیان کا ورثہ روایت سے ہی ملتا ہے، جس کے بغیر ترسیل وابلاغ ممکن نہیں اور قاری کے ساتھ رشتہ بھی قائم نہیں ہو سکتا۔

دوسرے، مشرق ومغرب آفاق میں ایک بھی ہوں تو ان کے درمیان ترجیح کا فرق ہوگا اور تقابلی مطالعہ کر کے دونوں کی اصناف سخن میں نوعیت واہمیت کی تعین کی جا سکتی ہے۔

تیسرے شاعری کی زبان الفاظ، تراکیب اور استعارات کے اعتبار سے جتنی سلیس فارسی اور اردو میں ہے مغرب کی کسی زبان میں نہیں۔ یہی حال کنایات وتلمیحات کی ثروت اور بلاغت کا ہے۔ مشرقی عروض یقیناً مغربی عروض سے زیادہ بالیدہ وکشادہ ہے، اس کے قافیہ وردیف میں جو نغمگی نیز ارتکاز تخیل ہے، وہ مغرب کے عروض کو نصیب نہیں، جب کہ معرّیٰ اور آزاد ہیئتیں سرے سے شاعری کی ہیئتیں نہیں؛ اسی لیے معرّیٰ کا استعمال سولہویں سے بیسویں صدی تک مثال کے طور پر انگریزی میں ڈراموں کے لیے ہوا، یہاں تک کہ ڈراموں میں جو گیت (Song) درج ہیں وہ مقفّٰی ہیں؛ یعنی تغزل کی اصلی ہیئت، جو جانِ شاعری ہے، قافیوں کی پابند ہے، نہ کہ اس سے خالی، یا آزاد، لہٰذا شاعری کو ڈرامے کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے، جو نثر میں بھی ہوتا ہے۔

چوتھے، افسانے اور ناول، اگر بے ماجرا ہوں تو ایک پریشاں خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ ان میں تجریدی عمل صرف وہ لوگ روا رکھتے ہیں، جو قصہ کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، حالاں کہ قصہ ہی وہ عنصر ہے، جو دلچسپی کا باعث ہوتا ہے اور حقیقی کرداروں کی تخلیق کرتا ہے، نیز معنی خیز اور فکر انگیز ہوتا ہے۔ افسانہ وناول کا پس منظر مشرق کی وہ حیرت انگیز داستانیں ہیں جو آج بھی قاری کی توجہ جذب کرلیتی ہیں، مغرب میں اساطیر (Legends and myths) کی ''شاخِ زرّیں'' (Golden Bough) کتنی ہی تاباں ہو، قابلِ یقین نہیں، لہٰذا غیر حقیقی اور اصلیت سے خالی ہے۔

پانچویں، تنقید فن کی تشریح وتفہیم اور تصریح وتنقیح کے لیے ہے، اسے نظریات کی بازی گری نہیں ہونا چاہیے، خواہ ادب کا مطالعہ کسی نقطۂ نظر، معیار اور موقف سے ہو۔ تنقید کا کام وہ فضا پیدا کرنی ہے، جس میں ادب صحیح طور پر لکھا اور پڑھا جائے۔ اقدار واخلاق کی وضاحت بھی تنقید کا ایک فریضہ ہے؛ تاکہ ادب کی ہستی کے علاوہ اس کی حیثیت کی پیمائش ہو اور مختلف تخلیقات کے درجات کا تعین کیا جاسکے۔ اس طرح بااصول اور غیر جانب دار تنقید، تخلیق کی مشیر اور معاون ہوتی ہے، بشرطیکہ ناقد باشعور، صاحب ذوق، کثیر المطالعہ اور بلند نظر ہو۔

مستقبل میں ادب کے تحفظ وترقی کے لیے مندرجہ بالا نکات پر غور وفکر کرکے انہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ورنہ سماج کا موجودہ انتشار اور ذرایعِ ابلاغ کا انفجار (explosion) تہذیب اور انسانیت کے لیے حد درجہ پُرخطر ہے۔

(''مریخ''، مارچ۔ستمبر۲۰۰۴ء صفحہ۔۳)

شبلی کے کمال تنقید کا انکار

(تردید و تدارک)

''معارف'' بابت ستمبر۸۸ء میں ایک مضمون ''علامہ شبلی کی تنقید نگاری وتصحیح واستدراک)'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس کے مصنف ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی، استاذ جامعہ اسلامیہ، مدینہ منوّرہ ہیں۔ درحقیقت یہ مضمون مذکور موضوع پر میرے اس مبسوط مقالے کے ایک حصے پر تبصرہ ہے، جو ''معارف'' بابت اپریل اور مئی ۸۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ فاضل تبصرہ نگار نے میرے مقالے کی دوسری قسط میں صرف ایک مقام کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ علامہ شبلی کی تنقید نگاری کو ان کے لفظوں میں جو ''زبردست اور بے نظیر خراج تحسین'' میں نے پیش کیا ہے، اس کے مستحق فی الواقع شبلی نہیں، علامہ حمید الدین فراہی ہیں؛ اس لیے کہ میں نے تبصرہ نگار کے خیال میں جن تنقیدی نکات پر اپنے خراج تحسین کی بنیاد رکھی ہے، ان کے مصنف دراصل فراہی ہیں۔ اس سلسلے میں مبصّر نے مقالات شبلی جلد دوم سے صفحہ۲۳ تا۲۸ میرے دیئے ہوئے اقتباسات کو فراہی کی کتاب ''جمہرۃ البلاغۃ'' کے مباحث قرار دیا ہے، جن کی عربی سے اردو میں ''ترجمانی اور تلخیص'' شبلی نے ''الندوہ'' بابت دسمبر ۱۹۰۵ء میں ''نظم القران وجمہرۃ البلاغۃ'' کے عنوان سے کی اور بعد میں یہی مضمون مذکور مقالات شبلی میں شامل ہوگیا۔

ظاہر ہے کہ میں نے تو خود ہی مقالات شبلی کے مذکور مباحث کا حوالہ دیدیا ہے، مگر میرا مقالہ ''علامہ شبلی کی تنقید نگاری'' پر ہے، نہ کہ علامہ فراہی کی تنقید نگاری پر اور شبلی نے پوری محققانہ دیانت داری کے ساتھ فراہی کی کتاب کا حوالہ دے کر بحثیں کی ہیں۔ یہ بحثیں شبلی کی ہیں اور ان ہی کے لفظوں میں ہیں۔ خواہ ان کو فراہی کے خیالات کی ''ترجمانی'' کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث اقتباسات کو پیش کرتے ہوئے مجھے کہنا پڑا:

''اس موضوع پر شبلی کی بحث کا خلاصہ ان ہی کے لفظوں میں یہ ہے''۔

جب زیر بحث اقتباسات خلاصۂ بحث ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحث کہاں ہے؟ اسی سوال کا جواب حاصل کرنے میں فاضل تبصرہ نگار ایک اشتباہ کے سبب دھوکا کھا گئے اور انہوں نے بالکل غلط اور مغالطہ انگیز باتیں کافی تحقیق اور غور وفکر کے بغیر تحریر کر دیں، یہ بھی نہ سوچ سکے کہ وہ شبلی جیسے مسلم الثبوت ماہر تنقید کے کمال کا انکار اور اس طرح احمد کی پگڑی محمود کے سر باندھنے کی زبان زد غلطی کر رہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل تبصرہ نگار نے نہ تو میرا مقالہ غور سے پڑھا اور نہ انہوں نے مقالات شبلی (ادبی) جلد دوم پر غائر نگاہ ڈالی۔ موصوف نے میرے مقالے کا جو دوسرا اقتباس دیا ہے، اس میں میرا بیان ہے:

> ''مشرقی ادبیات کی کامل آگہی کے سبب ہی علامہ شبلی نے زیر تبصرہ مجموعہ کے ایک مقالہ ''فن بلاغت'' میں ارسطو کے حوالہ سے مغربی تصور ادب وشعر کی دھجیاں اُڑا دی ہیں''۔

یہ مقالہ (''فن بلاغت'') زیر بحث مقالات شبلی کا دوسرا مقالہ ہے، جیسا فہرست پر ایک نظر ڈال کر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مقالہ ''نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ'' سے پہلے درج کیا گیا ہے، جو تیسرے نمبر پر ہے؛ یعنی شبلی کے ذریعے فراہی کی ترجمانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے؛ لیکن تبصرہ نگار نے تیسرے مقالے ہی کی ایک ذیلی سُرخی ''فن بلاغت'' پر اپنی نگاہ مرکوز کر دی ہے، جب کہ یہ مقالات شبلی کا کوئی مستقل مقالہ ہے ہی نہیں، محض تیسرے مقالے کا ایک جزو ہے اور میں نے ''فن بلاغت'' کو ایک مقالہ کہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہاں میری مُراد وہ مقالہ ہے، جو اس عنوان سے مقالات میں درج ہے اور وہ شبلی کے اپنے خیالات پر مشتمل ہے، کسی دوسرے کے خیالات کی ''ترجمانی'' نہیں ہے، کم از کم نہ تو شبلی اس مقالے کو دوسرے شخص کے خیالات کی ترجمانی کہتے ہیں، نہ مقالات شبلی کے مرتّب۔

اب دیکھنا چاہیے کہ میں نے شبلی کی تنقید نگاری کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے، وہ ان تمام ادبی تنقیدوں کے مبسوط تجزیہ ہے اور اس نتیجے تک پہونچنے کے لیے میں نے جمہرۃ البلاغۃ والے معدودے چند اقتباسات سے بہت زیادہ دوسرے اقتباسات شبلی کے اہم تنقیدی مقالات وتصانیف سے دیے ہیں، جن میں سرفہرست ''شعر العجم'' ہے، اس کے بعد ''موازنۂ انیس و دبیر'' ہے، خود مقالات شبلی جلد دوم کے مضمون نمبر ۵ بہ عنوان ''عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ'' کے ۹؍حوالے میں نے دیے ہیں۔

علامہ شبلی کی تنقید نگاری کے اس بحر ذخار میں علامہ فراہی کی جمہرۃ البلاغۃ کے چند قطرے کیا

حیثیت رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود کیا ستم ہے کہ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی، شبلی کے کمال تنقید کا انکار اس طمطراق سے کرتے ہیں:

> ''اب یہ بات بظاہر نہایت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ ایسا زبردست اور بے نظیر خراج تحسین جو فاضل مقالہ نگار نے علامہ شبلی کی تنقید نگاری کو تقریباً دو صفحوں میں پیش کیا ہے، اس کا مستحق علامہ شبلی کے بجائے کوئی اور شخص ٹھہرے؛ مگر امر واقعہ یہ ہے، اس لیے کہ ''بلاغت اور شاعری کی تشریحات'' علامہ شبلی کے بجائے علامہ حمید الدین فراہی کا نتیجۂ فکر ہیں''۔

تنقید نگاری میں علامہ شبلی کے استحقاق کو علامہ حمید الدین فراہی کی طرف منتقل کرنے کی جسارت کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا، جس نے ادب وتنقید کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہو اور کچھ نہیں تو کم از کم اردو ادب، اس کی تنقید اور شبلی کی تصانیف پر ایک نظر ڈالی ہو۔ علامہ فراہی کی جمہرۃ البلاغۃ یقیناً ایک نادر شئے ہے اور اس پر پوری علمی تحقیق وتنقید ہونی چاہیے؛ تاکہ علامہ موصوف کے ادبی کمالات کا بھی سراغ دنیا کو ملے؛ لیکن علامہ شبلی سے تنقید کے معاملے میں ان کا موازنہ ہمیشہ ایک غلط بات ہوگی اور اس کا کوئی فائدہ علامہ فراہی کو نہیں ہوگا، لہذا علامہ موصوف کی ادبیات پر کوئی بھی متوقع ومطلوب علمی کا اس کی اپنی حدود ہی میں ہونا چاہیے۔ ان حدود میں ایک حد یہ بھی ہوگی کہ علامہ شبلی جیسے عظیم ترین ناقد ادب نے علامہ فراہی کی ادبی تنقید سے اعتنا کیا، اس کا تعارف کرایا اور اس کے بعض مباحث کو اپنے دامن کمال میں جگہ دی۔

ان حقایق کی روشنی میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کا ''علامہ شبلی کی تنقید نگاری'' پر ''استدراک'' اور اس کی ''تصحیح''، محض تحریف اور مغالطہ انگیزی ہے، اسی طرح منیجر ''معارف'' کا یہ بیان بالکل غلط ہے کہ میں نے ''مقالات شبلی حصہ دوم'' (جیسے صحیح طور پر ''مقالات شبلی (ادبی) جلد دوم'' ہونا چاہیے) میں مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ کے ایک حصے کے اردو ترجمے کو مولانا شبلی کا مضمون سمجھا۔ میں نے سطور بالا میں واضح کر دیا ہے کہ جس تحریر کو میں نے مولانا کا مضمون سمجھا ہے، وہ مقالات میں صراحتہً مولانا کے مضمون ہی کی حیثیت سے درج ہے اور وہ مضمون دوسرا ہے جس پر ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے۔ اس سلسلے میں غلط فہمی ڈاکٹر صاحب کو ہوئی ہے؛ اس لیے کہ انہوں نے میرے مقالے اور مقالات شبلی کسی کا بھی غائر مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

(''مریخ''، پٹنہ، ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء صفحہ۔ ۷)

پروفیسر عبدالمغنی کا آخری یادگار انٹرویو

پروفیسر عبدالمغنی نے 22 اگست 2006ء کو روزنامہ ''پندار'' کے لیے مجھ سے بات چیت کی تھی۔ یہ انٹرویو 23 اگست کے شمارے میں اخبار کے پہلے صفحہ پر 8 کالمی سُرخی کے ساتھ نمایاں طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ پروفیسر عبدالمغنی کا آخری انٹرویو ہے۔ اُس وقت وہ کافی بیمار تھے؛ لیکن علالت کے باوجود انہوں نے ''پندار'' کے لیے مجھ سے گفتگو کی اور انجمن ترقی اردو، بہار میں انتشار کے تعلق سے میرے کئی سوالات کے جواب دیے۔ اس انٹرویو کی تاریخی حیثیت ہے؛ کیوں کہ بارہ۔ تیرہ دنوں کے اندر ہی 5 ستمبر 2006ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ پیش ہے مکمل انٹرویو:

پٹنہ، 22 اگست

انجمن ترقی اردو ریاست کی وہ واحد انجمن ہے، جس نے نہ صرف اردو تحریک کی قیادت کی؛ بلکہ اردو کے جائز حقوق کی بازیابی کے لیے اردو والوں میں سرفروشی کی تمنا بھی پیدا کی؛ لیکن یہ انجمن اپنے قیام کے بعد سے دو مرتبہ تقسیم ہو چکی ہے۔ پہلی تقسیم ۱۹۷۵ء میں مظفر پور میں ہوئی، جب پروفیسر عبدالمغنی اور الحاج غلام سرور میں اختلافات ہوگئے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت والی انجمن کا نام انجمن ترقی اردو بہار اور الحاج غلام سرور کی انجمن، بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کہلائی۔ اس طرح اردو کا کارواں دو حصوں میں بنٹ گیا۔ اس جھگڑے میں پروفیسر عبدالمغنی کامیاب رہے۔ ان کی انجمن کو سرکاری گرانٹ ملنے لگا۔ الحاج غلام سرور خاموش ہو کر بیٹھ گئے، پھر اُنہیں وزارت کی کرسی مل

گئی۔ اس کے بعد عملی طور پر اردو تحریک سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس دوران ''اردو بھون'' بنا اور انجمن ترقی اردو کو باضابطہ ایک آشیانہ بھی مل گیا؛ لیکن اردو کا یہ کارواں جو مظفر پور سے چلا تھا، چھپرہ میں آ کر ایک مرتبہ پھر انتشار کا شکار ہوگیا اور اس میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ عہدے اور سرکاری گرانٹ انتشار کا سبب بنے۔ پروفیسر عبدالمغنی کی قیادت والی انجمن نے چھپرہ میں انجمن کے منتخب سکریٹری عبدالقیوم انصاری پر انجمن کے ۸ لاکھ روپے خرد برد اور غبن کا الزام لگا کر انہیں سکریٹری کے عہدے سے پہلے معطل اور اس کے بعد برطرف کر دیا۔ الحاج ہارون رشید کو بھی جو انجمن کے کارگذار صدر تھے، عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد الحاج ہارون رشید اور عبدالقیوم انصاری کی ٹولی پروفیسر عبدالمغنی کے خلاف سرگرم ہوگئی۔ اس ٹولی نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ اس کی انجمن ہی اصلی انجمن ترقی اردو ہے، میدان میں کود پڑی اور مختلف اضلاع اور کمشنری میں بھی اپنی شاخیں قائم کر لیں۔ اب ایک ہی نام یعنی ''انجمن ترقی اردو بہار'' کے نام سے دو متوازی انجمنیں کام کر رہی ہیں اور دونوں کا دعویٰ ہے کہ وہی اصلی انجمن ہے۔ ان میں ایک کے صدر پروفیسر عبدالمغنی اور دوسری متوازی انجمن کے صدر الحاج ہارون رشید اور سکریٹری عبدالقیوم انصاری ہیں۔ اس پس منظر میں آج ''پندار'' کے چیف ایڈیٹر ریحان غنی نے پروفیسر عبدالمغنی سے ان کی رہائش گاہ پر غیر رسمی بات چیت کی۔ ہر چند کے وہ ان دنوں کافی بیمار ہیں۔ بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے ہیں۔ پیشاب کی تکلیف بھی ہے؛ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایک عرصہ کے بعد انجمن ترقی اردو کے تعلق سے کافی دیر تک بات چیت کی۔ اس کے اہم حصے ذیل میں پیش ہیں:

❁ انجمن ترقی اردو دو حصے میں بنٹ چکی ہے، اس پر آپ کا کیا ردِعمل ہے؟

ع۔م۔ یہ بہت افسوسناک ہے؛ لیکن اس میں دو گروپ نہیں ہے، انجمن ایک ہے، کچھ لوگوں نے ناجائز طریقے سے متوازی انجمن بنالی ہے، ان لوگوں نے انجمن کے ۸/لاکھ روپے غبن کر لیے ہیں۔

❁ اس کا ذمہ دار کون ہے اور غبن کا مقدمہ کیوں نہیں دائر کیا گیا؟

ع۔م۔ مقدمہ کر دیا گیا ہے اور محکمہ جاتی کارروائی بھی ہو رہی ہے، ہارون رشید نے انجمن اور اردو کے ساتھ غداری کی اور ان کی ہی سازش سے ۸/لاکھ روپے کا غبن ہوا۔ معاہدے کے

باوجود انہوں نے اور عبدالقیوم انصاری نے گرانٹ کی رقم واپس نہیں کی۔ اب جب ہارون رشید پر افتاد آپڑی ہے تو وہ امریکہ بھاگ گئے۔ یہ دو صاحبان ملزم نہیں، مجرم ہیں، کب تک بچیں گے، اللہ ہی جانتا ہے۔ ان دونوں کے خلاف دستور کے مطابق کارروائی کی گئی ہے۔ پہلے ان لوگوں سے حساب طلب کیا گیا، جب حساب نہیں دے سکے تو پہلے دونوں کو معطل کیا گیا، پھر برطرف کیا گیا۔ ان لوگوں کی وجہ سے انجمن میں گڑبڑی ہورہی تھی، اب جو لوگ انجمن میں ہیں، وہ سب وفادار ہیں۔ ان لوگوں نے اردو کے ساتھ غداری نہیں کی ہے۔

❁ اس جھگڑے سے اردو کا نقصان ہورہا ہے۔ کیا اس سے آپ کو اتفاق ہے؟

ع۔م۔ اس کا احساس مجھ سے زیادہ اور کسے ہوگا، جس نے پوری زندگی اردو کے لیے وقف کردی۔ پورے اردو والوں کے احساس کا سوال ہے۔ لوگوں میں جذبہ نہیں ہے۔ ہر شعبہ میں بے حسی طاری ہے۔ اردو تعلیم کی بھی فکر نہیں ہے، جب کہ معیشت سے اس کا تعلق ہے۔ میں نے انگریزی کی روٹی کھانے کے باوجود اپنے تمام بچوں کو اردو پڑھایا۔ آج میرے تمام بچے اللہ کے فضل سے برسرروزگار ہیں، جب کہ اس کے برعکس انگریزی پڑھنے والے لوگ بے کار بیٹھے ہیں۔ سماج پر زوال وانتشار کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ یہ دور مسلمانوں کی آزمائش کا ہے۔ ان کے پاس دولت کی کمی نہیں؛ لیکن کام کچھ نہیں ہورہا ہے۔ آگے بڑھ کر کوئی کام کرنے والا نظر نہیں آتا۔ یہ شاید ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان اپنے بل پر زندہ رہے گی، کسی کے سہارے پر نہیں۔

❁ اگر الحاج ہارون رشید اور عبدالقیوم انصاری مجرم ہیں تو اردو والے اُنہیں سزا کیوں نہیں دیتے؟ ان کا سماجی بائیکاٹ کیوں نہیں کرتے؟

ع۔م۔ یہ سوال آپ اردو والوں سے پوچھئے۔

❁ کیا اردو کی زبوں حالی کے لیے سابقہ حکومت ذمہ دار نہیں ہے؟

ع۔م۔ بالکل ہے۔ لالو پرساد نے ۱۵ر برسوں تک مسلمانوں اور اردو کو تباہ کیا۔ اب نتیش کمار آئے ہیں۔ دیکھئے کیا کرتے ہیں؟

❁ آپ بیمار ہیں۔ صدارت سے سبکدوش کیوں نہیں ہوجاتے؟

ع۔م۔ یہ صدارت میں نے چاہی نہیں تھی۔ یہ اس وقت کے اہل انجمن نے میرے سر

پر رکھ دی اور میں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اردو کا کام ہوا اور اردو کو سرکاری مراعات حاصل ہوئیں، لوگ وزیر ہوئے اور اردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بنوا سکے، میں وزیر نہیں رہا؛ لیکن میری صدارت میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا، اردو کو دوسری سرکاری زبان ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے نہیں بنایا؛ بلکہ یہ آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے فرمان سے دوسری سرکاری زبان بنی۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے میں ہچکچارہے تھے۔ اندرا گاندھی کا فرمان آیا کہ اردو والوں اور انجمن کا مطالبہ پورا کرو تو ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کو یہ حکم ماننا پڑا، میں آج بھی صدارت سے سبکدوش ہونے کو تیار ہوں، کوئی آگے تو آئے۔

❁ اردو تحریک پر جمود طاری ہے اور اردو کے مسائل حل نہیں ہورہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ع۔م۔ اردو دوست آگے آئیں۔ اردو کے دفاع کے لیے ایکشن کمیٹی بنائیں اور ان لوگوں سے لڑیں، جو غلط کار ہیں، خواہ وہ حکومت میں ہوں، یا حکومت سے باہر۔ آپ اخبار والے ہیں، خدا کو حاضر وناظر جان کر آپ لوگ حقائق کا جائزہ لیجئے۔

کاروانِ اردو کے ٹوٹے ہوئے تارے

۱۔سردار محمد لطیف الرحمٰن، ۲۔عزیزہ نقی امام، ۳۔عبدالقیوم انصاری، ۴۔ محمد ایوب ایڈوکیٹ، ۵۔الحاج غلام سرور، ۶۔ پروفیسر عبدالمغنی، ۷۔ مولانا عثمان غنی، ۸۔ مولانا بیتاب صدیقی، ۹۔شاہ مشتاق احمد، ۱۰۔الحاج ہارون رشید، ۱۱۔کامریڈ تقی رحیم، ۱۲۔مولانا شاہ عون احمد قادری، ۱۳۔ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، ۱۴۔سید سلطان احمد، ۱۵۔کامریڈ حبیب الرحمٰن، ۱۶۔مولانا فاروق الحسینی، ۱۷۔سید انیس الرحمٰن، ۱۸۔ رامائین سنگھ، ۱۹۔کلیان کمار پوددار، ۲۰۔فیاض الرحمٰن شارق، ۲۱۔عبدالقیوم لعل گنجوی، ۲۲۔مغفور احمد اعجازی، ۲۳۔ڈاکٹر ظفر حمیدی، ۲۴۔سید ضیا الدین احمد، ۲۵۔ نثار احمد ایڈووکیٹ، ۲۶۔ محمد معین انصاری، ۲۷۔ رضوان غنی اصلاحی، ۲۸۔ سید عرفان غنی، ۲۹۔ سید شاہ نورالدین احمد عرف پیارے صاحب، ۳۰۔انظار احمد ایڈوکیٹ، ۳۱۔صدیق مجیبی، ۳۲۔ممتاز حسن عارفی، ۳۳۔ذکی الدین احمد سہروردی، ۳۴۔ ڈاکٹر اسری ارشد، ۳۵۔ رمز عظیم آبادی، ۳۶۔ کلام حیدری، ۳۷۔قسیم الحق گیاوی، ۳۸۔قیوم خضر، ۳۹۔احمد یوسف، ۴۰۔ذکی وارثی، ۴۱۔مولانا امتیاز الحسینی، ۴۲۔عہد فاطمی، ۴۳۔مولانا نوراللہ رحمانی، ۴۴۔شاہد رام نگری، ۴۵۔علامہ فضل امام واقف، ۴۶۔ وفا ملک پوری، ۴۷۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی، ۴۸۔شمس الہدیٰ استھانوی، ۴۹۔شمس الہدیٰ بتیاوی، ۵۰۔ امین اعجازی، ۵۱۔ ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، ۵۲۔محمد نیاز، ۵۳۔نجم الحسن باروی، ۵۴۔ ڈاکٹر حکیم فضل الرحمٰن، ۵۵۔ زین الحق، ۵۶۔شمیم ربانی،

۵۷۔خواجہ فخر الدین، ۵۸۔مختار احمد عاصی، ۵۹۔ ناصر زیدی، ۶۰۔جمیل احمد ایڈوکیٹ، ۶۱۔غضنفر نواب دانش، ۶۲۔ ڈاکٹر نذر حسن، ۶۳۔ زبیر احمد جعفری، ۶۴۔ڈاکٹر اے ایچ عثمانی، ۶۵۔ یوسف رزاقی، ۶۶۔علاالدین مہتو، ۶۷۔سید بدرالدین احمد، ۶۸۔رحمٰن غنی، ۶۹۔احمد حسنین جعفری، ۷۰۔پروفیسر شعیب راہی، ۷۱۔ پروفیسر نادم بلخی، ۷۲۔مہجور شمشی، ۷۳۔صابر آروی، ۷۴۔جابر فیروز پوری، ۷۵۔مولانا ایوب شمیم ندوی، ۷۶۔ڈاکٹر ایم.او. صدیقی، ۷۷۔سید احمد کبیر، ۷۸۔سید خورشید عالم کاکوی، ۷۹۔شکیل احمد خاں، ۸۰۔شین میم عارف ماہر آروی، ۸۱۔ڈاکٹر شکیب ایاز، ۸۲۔معصوم شرفی اسیر، ۸۳۔آفتاب حیدر وغیرہ۔

آسماں سب کی لحد پر شبنم افشانی کرے

ختم شد